حوادث الفتاوی
جدید مسائل اور ان کا حل
جلد سوم
تالیف
حبیب الامت عارف باللہ
حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
شیخ الحدیث وصدر مفتی، بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور سنجر پور، اعظم گڑھ، یوپی
خلیفہ ومجاز بیعت
حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی وحضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری
ناشر
مکتبہ حبیب الامت جامعہ اسلامیہ دار العلوم
مہذب پور، پوسٹ سنجر پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)

حوادث الفتاوی

(جلد سوم)

تالیف:

حبیب الامت، عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجرپور، اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

خلیفہ ومجاز بیعت

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ وحضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ

ناشر

مکتبہ حبیب الامت

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، پوسٹ سنجرپور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

نام کتاب: حوادث الفتاوی (جلدسوم)
مصنف: حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
صفحات: 400
تعداد اشاعت: 1100
قیمت: 450
ناشر: مکتبہ حبیب الامت، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور
پوسٹ سنجر پور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ حبیب الامت جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ، یوپی
۲۔ مکتبہ الحبیب خانقاہ حبیب گوونڈی ممبئی
۳- مکتبہ الحبیب وخانقاہ حبیب جھٹکاہی ڈھاکہ ضلع مشرقی چمپارن
۴- مکتبہ طیّبہ دیوبند، سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

	پیش لفظ	۱۵
	نکاح مسیار کی شرعی حیثیت	۱۹
۱-	نکاح مسیار کا تعارف	۱۹
۲-	نکاح مسیار کے بارے میں علماء عرب کی آراء	۲۱
۳-	نکاح مسیار میں ولی کے حق اعتراض کا حکم	۲۴
۴-	نکاح مسیار سے کیا مقاصد نکاح حاصل ہوتے ہیں	۲۶
۵-	نکاح مسیار کے بارے میں علماء ہند کی آراء	۲۸
۶-	نکاح مسیار کے بارے میں علماء عرب کی آراء	۳۰
۷-	نکاح مسیار کے بارے میں حکومتوں کے قوانین	۳۳
۸-	نکاح مسیار کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی حیثیت	۳۵
۹-	نکاح موقت کا حکم	۳۷
۱۰-	نکاح مؤقت کی حقیقت اور ائمہ اربعہ کا موقف	۴۰
	دار القضاء کی آن لائن بعض کارروائیاں	۴۴
۱-	مدعی کا آن لائن دعویٰ پیش کرنے کا حکم	۴۴

۲-	کیامدعی علیہ آن لائن رفع الزام کرسکتا ہے؟	۴۶
۳-	کیا آن لائن گواہوں کی گواہی معتبر ہے؟	۴۸
۴-	کیاویڈیوکال پرمقدمہ کےفریق اورگواہوں کودیکھنا کافی ہوگا؟	۴۹
۵-	زمین کامعائنہ ویڈیوفون کے ذریعہ کافی ہوگا؟	۵۱
۶-	سامان کامشاہدہ آن لائن معتبر ہوگا؟	۵۳
۷-	آن لائن کارروائی کی صورت میں ویڈیو کے ذریعہ حکم جاری کرنا کافی ہوگا؟	۵۵
۸-	صرف آڈیوکال کے ذریعہ مدعی،مدعی علیہ کی گواہی کی اعتباریت کاحکم	۵۷
۹-	آن لائن اقرارکاحکم	۵۹
۱۰-	دارالقضاءکی کارروائی اگرآن لائن بھی ممکن نہ ہوپھرقاضی کیاکرے؟	۶۱
	ورچول کرنسی سے متعلق شرعی احکام	۶۵
۱-	کیاورچول کرنسی کوثمن اصطلاحی قراردیاجاسکتا ہے؟	۶۵
۲-	کیاکسی چیزکےکرنسی ہونے کے لئےحکومت کاتسلیم کرناضروری ہے؟	۶۸
۳-	ڈیجیٹل کرنسی پروجوب زکوۃ کاحکم	۷۰
۴-	کیاورچول کرنسی کے ذریعہ سرمایہ کاری جائز ہے؟	۷۵
۵-	کیاکاغذی کرنسی کادین ورچول کرنسی سےاداکیاجاسکتا ہے؟	۷۹

۶-	ورچول کرنسی کے ذریعہ مہر کی تعیین کا حکم	۸۲
	سودی قرض سے متعلق بعض مسائل	۸۵
۱-	لون یعنی حکومتی قرض لینے کا حکم	۸۵
۲-	کیا سودی قرض کے جواز کی گنجائش ہے؟	۸۸
۳-	کیا ضرورت وحاجت کی وجہ سے سودی قرض کو جائز کہا جا سکتا ہے؟	۹۰
۴-	دارالاسلام اور غیر دارالاسلام میں سودی نظام کا حکم	۹۳
	تشبہ سے متعلق مسائل	۹۶
۱-	تشبہ کی حقیقت کیا ہے؟	۹۶
۲-	تشبہ سے کونسا تشبہ مراد ہے؟	۹۹
۳-	تشبہ کے اصول	۱۰۱
۴-	من تشبہ بقوم فہو منہم کس درجہ کی روایت ہے؟	۱۰۴
۵-	کوئی وضع کبھی قوم کی پہچان ہو بعد میں ختم ہو جائے تو کیا حکم ہے؟	۱۰۶
	(ب) مذہبی امور میں تشبہ:	۱۰۸
۶-	ہندوؤں، عیسائیوں کے مذہبی امور میں شرکت کا حکم	۱۰۸
۷-	شعائر دین سے کیا مراد ہے؟	۱۱۲

	(ج) تہذیبی و قومی امور میں تشبہ:	۱۱۶
۸-	تہذیب کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے؟	۱۱۶
۹-	ساڑی، دھوتی، ٹائی وغیرہ پہننے کا حکم	۱۱۹
۱۰-	جو لباس غیر مسلموں میں کثرت سے پہنا جاتا ہے اگر مسلمانوں میں بھی رائج ہوجائے تو کیا حکم ہے؟	۱۲۲
۱۱-	مکان کی تعمیر میں ہندوؤں کے تصور کی رعایت کا حکم	۱۲۴
۱۲-	نیا سال منانے کا حکم	۱۲۷
۱۳-	بچوں کی اور شادی کی سال گرہ منانے کا حکم	۱۲۸
۱۴-	اپریل فول کا حکم	۱۲۹
	(د) دوسری جنس سے تشبہ کا حکم	۱۳۱
۱۵-	دوسری جنس سے تشبہ کا حکم	۱۳۱
۱۶-	مردوں کا کان اور گلا میں زیور پہننے کا حکم	۱۳۴
۱۷-	جس رنگ کے کپڑے عورتیں پہنتی ہیں مردوں کے لئے پہننے کا حکم	۱۳۶
۱۸-	شادیوں میں راجستھانی شیروانی پہننے کا حکم	۱۳۷
۱۹-	مردوں کے لئے مہندی لگانے کا حکم	۱۳۹
	مالِ حرام سے متعلق چند غور طلب امور	۱۴۲
۱-	مال حرام کے متعدد وجوہ کے احکامات	۱۴۲

نمبر	عنوان	صفحہ
۲-	حرام مال میں سے ترکہ کی تقسیم کا حکم	۱۴۵
۳-	مال حرام سے خریداری کی مختلف صورتوں کا حکم	۱۴۸
۴-	حرام پیسے سے خریدار کے ہاتھ سامان فروخت کرنے کا حکم	۱۵۲
۵-	حرام وحلال مخلوط مال میں غلبہ کا اعتبار کب ہوگا؟	۱۵۵
۶-	ایسی جگہ کاروبار کا حکم جہاں کے اکثر لوگ ناجائز کام کرتے ہوں	۱۵۹
۷-	ہدیہ دینے والے کے ذرائع آمدنی کی تحقیق کا حکم	۱۶۱
	جی ایس ٹی میں سودی رقم صرف کرنا	۱۶۵
۱-	جی، ایس، ٹی میں سودی رقم دینے کا حکم	۱۶۵
۲-	جی، ایس، ٹی میں سودی رقم کون دے سکتا ہے؟	۱۶۸
۳-	جی، ایس، ٹی کے عوض سودی رقم اپنے استعمال میں لانے کا حکم	۱۷۱
۴-	جی ایس ٹی میں سود کا کچھ حصہ دینے کا حکم	۱۷۵
۵-	دکاندار کا جی ایس ٹی نہ ادا کرنے کا حکم	۱۷۸
۶-	غیر واجبی ٹیکس میں سودی رقم دینے کا حکم	۱۸۲
	ہیلتھ انشورنس کے چند قابلِ غور پہلوؤں کی تنقیح	۱۸۸
۱-	ہیلتھ انشورنس کا حکم	۱۸۸
۲-	کیا پچاس، سو افراد اجتماعی انشورنس کرا سکتے ہیں؟	۱۹۱

۳-	اگر انشورنس کمپنی سال میں ایک مرتبہ چیک اپ ضرور کرائے تو کیا حکم ہے؟	۱۹۴
	اجتماعی قربانی سے متعلق بعض تحقیق طلب مسائل	۱۹۸
۱-	اجتماعی قربانی میں جانور اور حصے داروں کے حصہ کی تعیین کے بغیر قربانی کا حکم	۱۹۸
۲-	اجتماعی قربانی میں مخلوط گوشت سے حصہ داروں کو دینے کا حکم	۲۰۲
۳-	اجتماعی قربانی میں اگر کوئی جانور مر جائے تو اس کی بھرپائی کیسے ہوگی؟	۲۰۷
۴-	اجتماعی قربانی میں اگر کوئی جانور عیب دار ہو جائے تو اس کی بھرپائی کیسے ہوگی؟	۲۱۱
۵-	اجتماعی قربانی میں نام اور حصہ کی تعیین ذبح کے بعد کرنے کا حکم	۲۱۶
۶-	اجتماعی قربانی میں نام کی تعیین کے بعد نام تبدیل کرنے کا حکم	۲۲۰
۷-	اجتماعی قربانی میں منتظمین کو تعیین کے بعد نام تبدیل کرنے کا اختیار ہوگا یا نہیں؟	۲۲۲
۸-	اجتماعی قربانی کے بعد بچی ہوئی رقم کا حکم	۲۲۵
۹-	اجتماعی قربانی کے لئے حصے وصول کرنے والے کے لئے انعام کا حکم	۲۲۸
۱۰-	اجتماعی قربانی کے جانور سے نفع حاصل کرنے کا حکم	۲۳۱
۱۱-	اجتماعی قربانی کے لئے آئے ہوئے پیسوں سے جانور خریدا، اس پر نفع لے کر قربانی کا حکم	۲۳۵

۱۲-	اجتماعی قربانی کے لئے مدرسہ کے پیسوں سے جانور خریدنے کا حکم	۲۳۸
۱۳-	اجتماعی قربانی کا صاف وشفاف طریقہ	۲۴۱
	جانوروں کی مصنوعی افزائش	۲۴۶
۱-	جانوروں میں تلقیح کا حکم	۲۴۶
۲-	جانوروں کی افزائش کے لئے انجکشن لگانے کا حکم	۲۴۸
۳-	مرغیوں کی افزائش کے لئے مختلف چیزوں کے استعمال کا حکم	۲۵۲
۴-	مچھلیوں کی افزائش کا حکم	۲۵۵
۵-	افزائش کے لئے نجس اور حرام اشیاء کے ملانے کا حکم	۲۵۷
۶-	جانوروں میں تغییر خلقت کا حکم	۲۶۱
۷-	جانوروں کو تکلیف دہ مراحل سے گزارنے کا حکم	۲۶۴
۸-	آپریشن کی مشق اور دیگر ضرورتوں کے لئے جانوروں کے استعمال کا حکم	۲۶۸
۹-	مصنوعی افزائش والے جانور کے گوشت ودودھ کے استعمال کا حکم	۲۷۲
۱۰-	حلال جانور اور شوقیہ جانور کی مصنوعی افزائش کا حکم	۲۷۵
	موجودہ دور میں فسق سے مراد اور اس پر مرتب ہونے والے احکام	۲۷۹
۱-	فسق کی تعریف	۲۷۹
۲-	عبادات ومعاملات میں فاسق پر مرتب ہونے والے احکام	۲۸۲

۳-	داڑھی نہ رکھنے والے کی شہادت کا حکم	۲۸۵
۴-	فاسق کو مذہبی اداروں کا ذمہ دار بنانے کا حکم	۲۸۷
۵-	فسق فی العقیدہ سے کیا مراد ہے؟	۲۹۰
۶-	فاسق کی صرف زبان سے توبہ کا حکم	۲۹۳
۷-	بعض عرب علماء داڑھی کو سنن عادیہ سمجھتے ہیں ان کی اس سمجھ کا حکم	۲۹۶
۸-	ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والا فاسق ہے یا نہیں؟	۲۹۸
	عوامی مقامات پر نماز کا مسئلہ	۳۰۴
۱-	نماز کیسی جگہ پر ادا کی جائے؟	۳۰۴
۲-	پٹرول پمپ اور ریسٹورنٹ میں نماز ادا کرنے کا حکم	۳۰۷
۳-	خالی پلاٹ یا مملوکہ زمین پر نماز پڑھنے کا حکم	۳۰۹
۴-	کشادہ عام راستوں پر نماز پڑھنے کا حکم	۳۱۲
۵-	ریلوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ پر نماز پڑھنے کا حکم	۳۱۴
۶-	موجودہ صورت حال میں ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن پر نماز کا حکم	۳۱۷
۷-	ٹرین اور جہاز میں نماز پڑھنے کا حکم	۳۲۰
۸-	جہاز کے سفر میں وضو کے لئے نہ پانی ہو نہ مٹی تو وضو کا کیا حکم ہے؟	۳۲۳

۹-	ٹرین کے سفر میں ٹرین کا پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے وضو کی ہمت نہیں تو کیا کرے؟	۳۲۵
۱۰-	حکومت کی مملوکہ جگہوں پر نماز کی اجازت کی علامت کیا ہوگی؟	۳۲۸
	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	۳۳۱
۱-	آباءواجداد کی کمائی حرام تھی اب اولاد کیا کرے؟	۳۳۱
۲-	حرام مال کی آمدنی کا حکم	۳۳۴
۳-	شوہر کی مکمل کمائی حرام ہوتو بیوی کیا کرے؟	۳۳۶
۴-	مشکوک کمائی کی دعوت کا حکم	۳۳۸
۵-	دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ دعوت حرام کمائی سے کی گئی تھی تو اب کیا حکم ہے؟	۳۴۱
۶-	حرام مال کو حلال بنانے کا کوئی طریقہ ہے؟	۳۴۳
۷-	حرام مال کو مالک خود بطور قرض استعمال کرے تو کیا حکم ہے؟	۳۴۴
۸-	آدھا مال حرام ہو اور آدھا حلال تو اس سے مزدوری لینے کا حکم	۳۴۷
۹-	حرام کمائی سے حاصل کردہ زمین سے نفع اٹھانے کا حکم	۳۴۹
۱۰-	کارپوریشن سے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم دینے کا حکم	۳۵۲
۱۱-	جس بستی کے اکثر لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہوں ان کے ہدیہ کا حکم	۳۵۴

۱۲-	جس کی کمائی حرام ہو اس کے لئے دعاء کا حکم	۳۵۶
	سونے کی خرید و فروخت اور تبادلے کی بعض صورتوں کی تنقیح	۳۵۹
۱-	سونے کا خریدار ماہانہ قسطوں میں رقم جمع کرتا ہے اور بعد میں اتنی رقم کا سونا لیتا ہے، کیا حکم ہے؟	۳۵۹
۲-	خریدار کا گیارہ ماہ تک رقم جمع کرنا پھر اتنی مقدار کا زیور یا نقد لینے کا حکم	۳۶۳
۳-	خریدار گیارہ ماہ تک قسط جمع کرتا ہے اخیر میں وہ زیور لیتا ہے اس کا حکم	۳۶۷
۴-	قسط وار ایک لاکھ دس ہزار جمع کرانے کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار کا سونا لینے کا حکم	۳۷۱
۵-	قسط وار پیسے جمع کروا کر قرعہ اندازی کے ذریعہ سونا دینے کا حکم	۳۷۵
۶-	قسط مکمل ہونے کے بعد قیمت میں کمی زیادتی کے ساتھ سونا لینے کا حکم	۳۷۹
۷-	پرانا سونا دے کر نیا سونا لینا، اس کی متعدد صورتوں کا حکم	۳۸۲
۸-	سونے کا سونے سے تبادلہ کی ایک شکل اور اس کا حکم	۳۸۶
۹-	اگر نئے اور پرانے سونے کی قیمت الگ الگ لگا کر تبادلہ کیا جائے تو کیا حکم ہے؟	۳۹۱
۱۰-	سونا خرید کر دوسرے تاجر کو فروخت کرنا اور قیمت بعد میں لینے کا حکم	۳۹۶

☆☆☆

پیش لفظ

زمانے کی تبدیلی اور فقہ اسلامی کی رہنمائی دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور اپنے ساتھ نت نئے مسائل، چیلنجز اور حالات لے کر آتا ہے۔ انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل کے لیے رہنمائی فراہم کرنا اور ان کے حل کے لیے شریعت کی روشنی میں مؤثر طریقے سے راہ نکالنا علماء اور مفتیان کرام کی ذمہ داری ہے۔ دین اسلام کی جامعیت کا یہ کمال ہے کہ وہ ہر زمانے، ہر معاشرت اور ہر ماحول کے تقاضوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلامی فقہ کی یہی وسعت اور گہرائی اسے ہر عہد میں انسانی رہنمائی کے لیے موزوں اور مؤثر بناتی ہے۔

فتاویٰ کی تاریخ اور ضرورت:

جب ہم اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے عہد کے مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل پیش کیا ہے۔ یہ سلسلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دور سے شروع ہوا اور تابعین، تبع تابعین، مجتہدین اور محدثین کے ذریعے جاری رہا۔ فقہ کی عظیم خدمات میں سے ایک "فتویٰ نویسی" بھی ہے، جو دین کی عملی رہنمائی کا ایک زریں باب ہے۔ ہر دور کے فتاویٰ میں اس زمانے کے

خاص مسائل کی جھلک نظر آتی ہے، اور اسی کی روشنی میں نئی نسلیں رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ جب مسائل کی نوعیت بھی تبدیل ہونے لگی تو علماء کرام نے اپنی دور اندیشی اور اجتہادی بصیرت سے شریعت کے اصولوں کے مطابق مسائل کا حل پیش کیا۔ یہی اجتہادی بصیرت اسلامی فقہ کو ایک زندہ اور متحرک نظام بناتی ہے، جو کبھی بھی فرسودگی یا جمود کا شکار نہیں ہوتا۔

جدید مسائل اور علمائے کرام کا کردار:

آج کا دور، جسے ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کا دور کہا جاتا ہے، نئے چیلنجز اور غیر معمولی مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ جدید بینکاری نظام، بایومیڈیکل سائنسز، ڈیجیٹل کرنسی، مصنوعی ذہانت، اور سماجی مسائل جیسے امور ایسے ہیں جن کے حل کے لیے شریعت کی رہنمائی درکار ہے۔ علماء کرام نے ہمیشہ ان مسائل کا حل پیش کرنے میں محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور جدید تحقیقات کو شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ کرنے میں اپنی دانشمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حضرات مفتیان کرام کا یہ کارنامہ کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ وہ اپنے دوش ناتواں پر یہ عظیم ذمہ داری لیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کرتے ہیں بلکہ شریعت کے اصولوں کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس عمل میں وہ دین کی بنیادی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے انسانی معاشرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

حوادث الفتاویٰ: ایک اہم کاوش:

فتویٰ نویسی کے اس سلسلے میں ایک عظیم اضافہ "حوادث الفتاویٰ" جیسی کتب ہیں، جو اسلامی فقہ کے ماہرین کی انتھک محنت اور خلوص کا نتیجہ ہیں۔ "حوادث الفتاویٰ" جلد 3 ایسی ہی ایک علمی کاوش ہے، جو زمانے کے نئے مسائل کا شریعت کی روشنی میں خوش اسلوبی سے حل پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے اپنی فکری گہرائی اور فقہی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے موضوعات پر رہنمائی فراہم کی ہے، جو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف علماء وطلبہ کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہے بلکہ عام مسلمان بھی اس سے اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا حل پا سکتے ہیں۔ اس کی ترتیب وتدوین اور موضوعات کے انتخاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے نہایت عرق ریزی اور بصیرت کے ساتھ کام کیا ہے۔

خراج تحسین:

یہ کہنا بجا ہوگا کہ "حوادث الفتاویٰ" جلد 3 جیسی کتب دین اسلام کی ابدی رہنمائی کی زندہ مثال ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں خراج تحسین حاصل کرے گی اور علماء ومفتیان کرام کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ یہ کتاب نہ صرف ماضی کے علماء کی بصیرت کا تسلسل ہے بلکہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے فقہی رہنمائی کا ایک انمول خزانہ بھی ہے۔

اختتامیہ:

اسلامی فقہ کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علمائے کرام کی محنت اور کاوشوں سے دین اسلام ہر زمانے میں انسانیت کے لیے رہنمائی فراہم کرتا رہے گا۔ ”حوادث الفتاویٰ“ جیسے علمی شاہکار ہمیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ دین اسلام اپنی جامعیت اور وسعت کے ذریعے ہمیشہ موجودہ اور آئندہ مسائل کے حل کے لیے ایک کامل رہنما رہے گا۔

فقط

مفتی حبیب اللہ قاسمی

خادم الحدیث والافتاء

بانی و مہتمم

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڑھ، یوپی انڈیا

۱۰/۷/۱۴۴۶ھ، مطابق ۱۱/۱/۲۰۲۵ء

نکاح مسیار کی شرعی حیثیت

نکاح مسیار کا تعارف

سوال:(1)

کیا قدیم فقہاء کے یہاں نکاح مسیار کا کوئی ذکر ملتا ہے؟

جواب:(1)

نکاحِ مسیار جدید دور کی ایک اصطلاح ہے، جو بنیادی طور پر ایک ایسا نکاح ہے جس میں زوجین باہمی رضامندی سے کچھ عمومی حقوق (مثلاً نان نفقہ یا ایک ساتھ رہائش) کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ اصطلاح قدیم فقہائے کرام کے زمانے میں معروف نہ تھی، لیکن اس نوعیت کے نکاح کی جزئیات پر فقہائے احناف نے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے، خاص طور پر نکاح کی صحت و بطلان اور حقوق کے معاف کرنے کے ضمن میں۔

فقہ حنفی کے اصول:

فقہ حنفی میں نکاح کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام ارکان و شرائط پر پورا اترے، جن میں زوجین کی رضامندی، گواہوں کی موجودگی، اور مہر شامل ہیں۔ اگر یہ

شرائط پوری ہوں اور نکاح کا مقصد شرعی حدود میں رہے، تو نکاح معتبر ہوگا، چاہے زوجین باہمی رضامندی سے کچھ حقوق معاف کردیں۔

۱- زوجین کے حقوق معاف کرنے کا جواز:

فقہ حنفی کی معتبر کتاب الفتاویٰ الہندیہ میں ذکر کیا گیا ہے:

"إذا تراضی الزوجان علی إسقاط شیء من حقوقهما جاز ذلک"

(الفتاویٰ الہندیہ، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 306)

ترجمہ: اگر میاں بیوی باہمی رضامندی سے اپنے کچھ حقوق معاف کرنے پر راضی ہوں، تو یہ جائز ہے۔

۲- اقامتِ زوجیت کی شرائط:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"النکاح شرع لإفادة حل الاستمتاع ودوام العشرة" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 274)

ترجمہ: نکاح کا مقصد شرعاً جائز تعلق قائم کرنا اور باہمی زندگی کو قائم رکھنا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا اصل مقصد باہمی حقوق کی ادائیگی اور ساتھ رہنے کی نیت ہے، لیکن اگر کوئی شرط معاف کردی جائے تو نکاح باطل نہیں ہوگا، بشرطیکہ باقی شرائط پوری ہوں۔

۳-نفقہ کے معاف کرنے کی حیثیت:

فقہ حنفی میں شوہر کے ذمہ نفقہ واجب ہے، لیکن اگر عورت نفقہ معاف کر دے اور شوہر راضی ہو، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

"**وإن رضيت المرأة بإسقاط النفقة عن زوجها جاز**" (الدر المختار، جلد 3، صفحہ 584)

ترجمہ: اگر عورت اپنے شوہر سے نفقہ معاف کر دے اور شوہر اسے قبول کر لے، تو یہ جائز ہے۔

خلاصہ:

نکاح مسیار، جو جدید اصطلاح ہے، اپنے اصولی پہلوؤں میں فقہ حنفی کے مطابق درست ہے، بشرطیکہ وہ نکاح کی بنیادی شرائط پوری کرے۔ تاہم، اس نکاح کا عمومی رواج دینِ اسلام کے مزاج اور نکاح کے اصل مقاصد کے خلاف ہوسکتا ہے، لہٰذا اس سے اجتناب بہتر ہے۔

نکاح مسیار کے بارے میں علماء عرب کی آراء

سوال: (2)

نکاح مسیار کی کیا صورتیں اختیار کی جاتی ہیں اور کن اسباب کے تحت اس کی

نوبت آتی ہے، معاصر اہل علم کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے وضاحت فرمائیں۔

جواب:(2)

نکاح مسیار کے بارے میں معاصر علماء کی آراء کو جاننے کے لیے کئی کتابوں اور فتاویٰ میں حوالہ جات ملتے ہیں، جن میں مختلف نقطہ نظر تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ذیل میں اس موضوع پر معاصر علماء کے دلائل اور ان کے حوالہ جات پیش کیے جارہے ہیں:

ا- جواز کے قائل علماء کی رائے:

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ:

سعودی عرب کے مشہور عالم شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے نکاح مسیار کو بنیادی شرائط (ایجاب وقبول، گواہان، مہر) کی موجودگی میں جائز قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اگر عورت اپنی رضامندی سے نان نفقہ یا شب باشی کے حقوق معاف کردے، تو یہ نکاح جائز ہے، کیونکہ اس میں شرعی ممانعت کا کوئی پہلو نہیں''۔ (ماخوذ: فتاویٰ ابن باز، جلد 4، ص 107)

شیخ صالح الفوزان:

شیخ الفوزان نے بھی نکاح مسیار کو ضرورت کے تحت جائز کہا ہے، بشرطیکہ یہ خفیہ نہ ہو اور اس سے فتنہ پیدا نہ ہو۔ (ماخوذ: المنتقی من فتاوی الفوزان، جلد 3، ص 241)

۲-عدم جواز کے قائل علماء کی رائے:

شیخ یوسف القرضاوی:

شیخ القرضاوی نے نکاح مسیار کو فطری ازدواجی زندگی کے مقاصد کے خلاف سمجھتے ہوئے غیر مناسب قرار دیا ہے۔

شیخ القرضاوی کے مطابق، نکاح مسیار اس وقت جائز ہے جب اس میں نکاح کے تمام شرعی ارکان اور شروط مکمل ہوں، یعنی:

۱-ولی کی موجودگی

۲-گواہوں کی موجودگی

۳-مہر کا تعین

۴-ایجاب وقبول

تاہم، آپ نے اس نکاح کی ممانعت یا کراہت کا اظہار اس وقت کیا ہے جب یہ معاشرتی یا اخلاقی مسائل پیدا کرے، جیسے کہ:

-عورت کے حقوق کی پامالی

-بچوں کی پرورش کے مسائل

-نکاح کو کھیل تماشہ بنانا

آپ نے فرمایا کہ نکاح مسیار ایک اضطراری حل کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جن کی ضرورتوں کا روایتی نکاح سے پورا ہونا ممکن

نہیں۔لیکن آپ نے اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کے نکاح کو عام رواج بنانا یا اس کی ترغیب دینا درست نہیں، کیونکہ یہ خاندان کے مضبوط بندھن کو کمزور کرسکتا ہے۔

شیخ القرضاوی کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ نکاح مسیار شرعی طور پر جائز ہے، لیکن یہ ایک غیر مثالی صورت ہے جس سے حتی الامکان اجتناب کیا جانا چاہیے، اور اگر کسی ضرورت کے تحت کیا جائے تو تمام شرعی تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے منفی اثرات سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے۔

القرضاوی رحمہ اللہ کی رائے معتدل اور تفصیلی ہے۔آپ نے اس نکاح کو اصولی طور پر جائز قرار دیا لیکن کچھ اہم شرائط اور حالات کے ساتھ، تاکہ یہ نکاح شرعی حدود سے باہر نہ نکلے اور اس کے مضر اثرات سے معاشرہ محفوظ رہے۔

نکاح مسیار کے حوالے سے معاصر علماء کی آراء اور ان کے دلائل مختلف کتابوں اور فتاویٰ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

نکاح مسیار میں ولی کے حق اعتراض کا حکم

سوال:(3)

نکاح مسیار کی بعض صورتوں میں خواتین اپنے حقوق سے دستبردار ہوجاتی ہیں، بعض دفعہ اپنے نکاح کو خفیہ رکھتی ہیں، ان صورتوں میں ان کے اولیاء اپنے لئے ہتک محسوس کرتے ہیں، اس پس منظر میں کیا نکاح مسیار میں ولی کو حق اعتراض ہوگا؟

جواب :(3)

فقہ حنفی کے مطابق نکاح میں ولی کی رضامندی ضروری نہیں ہے، بشرطیکہ عاقل بالغ عورت خود نکاح کر رہی ہو اور نکاح شرعی شرائط کے مطابق ہو۔ اس لیے اگر کوئی بالغ خاتون نکاح مسیار میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو یا نکاح کو خفیہ رکھے تو اس پر ولی کو شرعاً اعتراض کا حق نہیں ہوگا، کیونکہ عورت اپنے نکاح کی مالک ہے اور شریعت نے بالغ عورت کو اس سلسلے میں خود مختاری دی ہے۔

اس کے دلائل فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں درج ہیں:

ہدایہ میں ہے:

"وَإِذَا زَوَّجَتْ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا بِإِذْنِ وَلِيِّهَا أَوْ بِغَيْرِ إِذْنِهِ فَهُوَ جَائِزٌ فِي الْأَصَحِّ" (ہدایہ، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 191)

ترجمہ: اگر عورت نے اپنے ولی کی اجازت سے یا بغیر اجازت کے اپنا نکاح خود کر لیا تو وہ نکاح صحیح ہے، اور یہی قول اصح ہے۔

۲- بدائع الصنائع میں ذکر ہے:

"وَإِنْ عَقَدَتْ الْمَرْأَةُ الْبَالِغَةُ الْعَاقِلَةُ عَلَى نَفْسِهَا كَانَ النِّكَاحُ صَحِيحًا" (بدائع الصنائع، جلد 2، صفحہ 255)

ترجمہ: اگر بالغ اور عاقل عورت نے اپنا نکاح خود کیا تو نکاح صحیح ہوگا۔

۳- فتاویٰ عالمگیری میں واضح ہے:

"إِنَّ النِّكَاحَ لَا يَفْسُدُ بِعَدَمِ وَلِيٍّ فِي حَقِّ الْبَالِغَةِ" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، صفحہ 283)

ترجمہ: بالغ عورت کے حق میں نکاح ولی کی غیر موجودگی کی وجہ سے فاسد نہیں ہوگا۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ بالغ عورت نکاح کے معاملے میں خودمختار ہے اور ولی کو اعتراض کا شرعی حق نہیں ہے، البتہ اگر نکاح سے کوئی اخلاقی یا سماجی نقصان ہوتو ولی خیر خواہی کے طور پر مشورہ دے سکتا ہے، لیکن اس کا اعتراض قانونی یا شرعی لحاظ سے مؤثر نہیں ہوگا۔

نکاح مسیار سے کیا مقاصد نکاح حاصل ہوتے ہیں

سوال: (4)

کیا شریعت کے جو مقاصد نکاح سے متعلق ہیں، زواج مسیار سے پورے ہوتے ہیں، اگر نہیں تو ایسی صورت میں نکاح مسیار کا کیا حکم ہے؟

جواب: (4)

نکاح مسیار ایک ایسا نکاح ہے جس میں شوہر اور بیوی باہمی رضامندی سے کچھ ازدواجی حقوق معاف کر دیتے ہیں، جیسے نان ونفقہ، رہائش، یا شب باشی وغیرہ۔ اس قسم کے نکاح کا تصور فقہ حنفی کے عمومی قواعد کے تحت جائز ہے، کیونکہ شریعت میں نکاح کے بنیادی ارکان یعنی ایجاب وقبول اور گواہوں کی موجودگی کے ساتھ عقد مکمل ہوجاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے نکاح میں شریعت کے جو مقاصد ہیں، وہ پوری طرح حاصل نہیں

ہوتے، خاص طور پر زوجین کے درمیان سکون، محبت، اور نسل کی افزائش کے مقاصد۔

فقہ حنفی کے مستند مآخذ میں یہ اصول موجود ہے کہ نکاح کے مقاصد صرف جسمانی تعلق تک محدود نہیں ہیں بلکہ ازدواجی زندگی کے دیگر پہلو، جیسے نفقہ، رہائش، اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا بھی اس کا حصہ ہیں۔ امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"النكاح موضوع لتمام السكن والمودة والرحمة وهو عقد يفيد اختصاص الزوجين كل واحد منهما بالآخر شرعاً" (المبسوط، جلد 4، صفحہ 193)

یعنی نکاح سکون، محبت، اور رحمت کے لیے مشروع ہے اور اس سے زوجین کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ شرعی طور پر خصوصی تعلق قائم ہوتا ہے۔

زواج مسیار میں، اگرچہ نکاح کے بنیادی ارکان پورے ہو رہے ہیں، لیکن ان مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی، جو نکاح کی روح ہیں۔ اس لیے فقہ حنفی کی روشنی میں اس نکاح کو مکروہ قرار دیا جائے گا، خاص طور پر اگر اس سے فریقین یا ان کے خاندانوں میں نقصان یا فتنے کا اندیشہ ہو۔

خلاصہ:

نکاح مسیار فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت بنیادی طور پر جائز تو ہے، لیکن یہ نکاح کے اصل مقاصد کو پورا نہیں کرتا، اس لیے مکروہ اور غیر پسندیدہ قرار دیا جائے گا، خاص طور پر اگر اس سے نکاح کی حکمت اور مقاصد فوت ہو جائیں۔

نکاح مسیار ایک ایسا نکاح ہے جس میں شوہر اور بیوی باہمی رضامندی سے

ازدواجی زندگی کے بعض حقوق (جیسے نفقہ، سکونت وغیرہ) ساقط کر لیتے ہیں۔ یہ نکاح عمومی طور پر ان حالات میں کیا جاتا ہے جہاں شوہر اور بیوی اپنی مخصوص ضروریات یا حالات کی بنا پر روایتی ازدواجی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتے۔

نکاح مسیار کے بارے میں علماء ہند کی آراء

سوال:5(الف)

نکاح مسیار کے متعلق آپ کے علم میں علماء ہند کی آراء ہوں تو ان کو تحریر کیا جائے۔

جواب:5(الف)

علماء ہند کے فتاویٰ اور آراء:

علماء ہند کے ہاں اس مسئلہ میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے معتبر کتب کے حوالہ جات درج ہیں:

ا-فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:

دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ میں نکاح مسیار کے متعلق لکھا گیا ہے کہ اگر شرعی شرائط نکاح (مثلاً گواہان کی موجودگی اور ولی کی اجازت) پوری ہوں تو نکاح درست ہوگا، لیکن حقوق کو ساقط کرنا اگر غیر معمولی مجبوری کے تحت ہو تو گنجائش ہے، البتہ یہ عام

حالات میں پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ یہ نکاح کے مقاصد کے خلاف ہے۔

۲-فتاویٰ مظاہرالعلوم سہارنپور:

اس کتاب میں لکھا گیا ہے کہ نکاح مسیار چونکہ بعض اوقات نکاح کی اصل روح کو متاثر کرسکتا ہے، اس لیے یہ احتیاطاً ترک کرنا بہتر ہے۔

۳-فتاویٰ رحیمیہ (مفتی عبدالرحیم لاجپوری):

اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ نکاح مسیار شریعت کے اصولوں کے مطابق جائز تو ہے، لیکن اس میں پیش آنے والے عملی مسائل کی وجہ سے اسے اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

۴-مستفاد فتاویٰ امدادالفتاویٰ:

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ذکر کیا ہے کہ نکاح میں حقوق کی معافی فریقین کی باہمی رضامندی سے درست ہے، لیکن اس معافی سے اگر فتنہ وفساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

نکاح مسیار کے فقہی پہلو:

فقہاء کے نزدیک نکاح مسیار اس وقت جائز ہوگا:

جب نکاح کی بنیادی شرائط پوری ہوں (گواہان، ولی، حق مہر)۔

حقوق کی معافی فریقین کی رضامندی سے ہو۔

تاہم، علماء کرام نے یہ بھی تنبیہ کی ہے کہ یہ نکاح فتنوں کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے اسے عام کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

خلاصہ:

نکاح مسیار شرعی اصولوں کے مطابق جائز ہے بشرطیکہ شرائط نکاح پوری ہوں، لیکن عمومی طور پر یہ طریقہ نکاح پسندیدہ نہیں ہے اور فقہی احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے۔

نکاح مسیار کے بارے میں علماء عرب کی آراء

سوال:5(ب)

نکاح مسیار سے متعلق ممتاز علماء عرب کی آراء پر بھی روشنی ڈالی جائے

جواب:5(ب)

ا-جواز کے قائل علماء کی آراء:

(ا) شیخ عبدالعزیز بن باز رحمه الله:

شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے نکاح مسیار کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ نکاح کی بنیادی شرائط (ایجاب وقبول، گواہان، مہر) پوری ہوں اور عورت اپنی مرضی سے کچھ

حقوق معاف کرے۔وہ فرماتے ہیں:

''نکاح مسیار اس شرط پر جائز ہے کہ اس میں تمام شرائط مکمل ہوں اور دونوں فریقین رضامند ہوں''۔(ماخذ: فتاویٰ ابن باز،جلد 4،ص 107)

(۲) شیخ صالح الفوزان:

شیخ صالح الفوزان بھی نکاح مسیار کو شرعی اصولوں کے مطابق جائز قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک اس نکاح کی اجازت بعض خاص حالات میں دی جاسکتی ہے۔

(ماخذ: المنتقی من فتاوی الفوزان،جلد 3،ص 241)

(۳) شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ:

شیخ العثیمین نے بھی نکاح مسیار کے جواز کا فتویٰ دیا ہے،لیکن ساتھ میں اس کے ممکنہ منفی اثرات کے بارے میں خبردار کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''اگر عورت اپنی رضامندی سے اپنے کچھ حقوق معاف کر دے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں،لیکن اس کے غلط استعمال سے اجتناب ضروری ہے''۔(ماخذ: فتاویٰ العثیمین،جلد 2،ص 793)

۲-عدم جواز کے قائل علماء کی آراء:

(۱) شیخ یوسف القرضاوی

شیخ یوسف القرضاوی نکاح مسیار کو غیر مناسب قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ نکاح

ازدواجی زندگی کے بنیادی مقاصد، یعنی سکون اور معاشرتی استحکام کے خلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ نکاح ازدواجی تعلقات کی روح کے خلاف ہے اور معاشرتی انتشار کا سبب بن سکتا ہے'' (ماخذ: فتاویٰ معاصرہ، جلد 1، ص 299)

(۲) شیخ علی الطنطاوی رحمہ اللہ

شیخ الطنطاوی رحمہ اللہ نے نکاح مسیار کو اسلامی اصولوں کے منافی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نکاح معاشرتی فتنوں اور ناانصافی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

(ماخذ: فتاویٰ الطنطاوی، جلد 5، ص 85)

۳- دیگر حوالہ جات

الموسوعة الفقهية الكويتية:

نکاح مسیار پر تفصیلی بحث میں کہا گیا ہے کہ یہ نکاح بنیادی طور پر جائز ہے، لیکن اس کے منفی اثرات کے پیش نظر علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (ماخذ: الموسوعة الفقهية، جلد 41، ص 134)

فقه الأسرة المعاصرة:

اس کتاب میں معاصر مسائل پر بحث کرتے ہوئے نکاح مسیار کو جائز قرار دینے والے اور اس کے مخالفین کے دلائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ (مصنف: د۔ وهبة الزحیلی، جلد 2، ص 119)

خلاصہ:

نکاح مسیار پر جواز یا عدم جواز کی بحث کا انحصار اس کے عملی پہلوؤں اور مقاصد پر ہے۔ جواز کے قائل علماء شرعی اصولوں کے مطابق اسے جائز کہتے ہیں، جبکہ بعض علماء اسے ازدواجی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے خلاف سمجھتے ہیں۔

نکاح مسیار کے بارے میں حکومتوں کے قوانین

سوال:5(ج)

نکاح مسیار سے متعلق اگر مسلم حکومتوں کے کسی نظام وقانون کا علم ہو سکے تو اس کو بھی سامنے لایا جائے۔

جواب:5(ج)

مسلم ممالک میں نکاح مسیار کے قوانین:

جہاں تک مسلم حکومتوں کے قوانین کا تعلق ہے، تو مختلف مسلم ممالک میں اس نکاح کے حوالے سے مختلف قوانین اور موقف اپنائے گئے ہیں:

ا-سعودی عرب:

سعودی عرب میں نکاح مسیار کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، بشرطیکہ نکاح

کے تمام شرعی اصول، مثلاً گواہان، حق مہر، اور ولی کی رضامندی، پوری ہوں۔ تاہم، یہ نکاح عموماً خفیہ رکھا جاتا ہے اور اس پر سماجی تنقید بھی کی جاتی ہے۔

۲-مصر:

مصر میں نکاح مسیار قانونی ہے، لیکن وہاں کے فقہاء اور معاشرتی رہنماؤں کی طرف سے اسے ناپسندیدہ اور غیر مثالی تصور کیا جاتا ہے۔

۳-کویت:

کویت میں بھی اس نکاح کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، مگر اس کی سماجی حیثیت متنازع ہے۔

۴-دیگر ممالک:

بعض مسلم ممالک میں اس نکاح کو یا تو تسلیم نہیں کیا جاتا یا پھر اس پر پابندی عائد ہے، مثلاً اردن اور تیونس جیسے ممالک جہاں نکاح کو سماجی استحکام کے لیے اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اس قسم کے نکاح کو اس استحکام کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔

خلاصہ:

یہ ہے کہ مسلم حکومتوں کے قوانین اس نکاح کے حوالے سے یکساں نہیں ہیں اور ہر ملک اپنے سماجی، قانونی اور فقہی پس منظر کے مطابق اس پر قانون سازی کرتا ہے۔ اس لیے نکاح مسیار کی حیثیت کسی خاص ملک کے نظام و قانون کو مدنظر رکھتے

ہوئے طے کی جانی چاہیے۔

نکاح مسیار کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی حیثیت

سوال:(6)

زواج مسیار کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی سماجی حیثیت کیا ہوگی؟ان کے نفقہ کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں اور فوائد ونقصانات کی بھی نشان دہی کریں۔

جواب:(6)

زواجِ مسیار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کی حیثیت:

زواجِ مسیار سے پیدا ہونے والے بچے شرعی لحاظ سے جائز اور نکاح کے ذریعہ ہی پیدا شدہ شمار ہوں گے، کیونکہ ان کا تعلق ایک صحیح نکاح سے ہے۔لہٰذا ان بچوں کی سماجی حیثیت عام بچوں کی طرح ہوگی، اور انہیں تمام شرعی حقوق ملیں گے، مثلاً: وراثت،نسب کی پہچان،اور دیگر حقوق۔

نفقہ کی ذمہ داری:

شریعت کے مطابق بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری ان کے والد پر ہوگی، جیسا

کہ قرآن میں ہے:

"**وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف**" (سورۃ البقرہ:233)۔

یعنی والد پر بچوں کے کھانے پینے اور لباس کی ذمہ داری ہے۔

زواجِ مسیار میں بھی بچوں کے والد کو ان کا نفقہ فراہم کرنا ہوگا، خواہ بیوی نفقہ نہ لینے پر راضی ہو، کیونکہ یہ بچوں کا مستقل حق ہے اور اس پر والد کو قاصر نہیں کیا جا سکتا۔

فقہ حنفی میں متعلقہ حوالہ:

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق، کسی بھی صحیح نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے جائز ہوں گے، اور والدین پر ان کے حقوق لازم ہوں گے:

"**وإن كان الفراش قائماً فالولد لاحق به، لأن النكاح يوجب ثبوت الفراش بين الزوجين**" (ہدایہ، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 219)

یعنی نکاح کی موجودگی میں بچے کا نسب والد سے ثابت ہوتا ہے اور اس کا حق والدین پر لازم ہوتا ہے۔

زواجِ مسیار کے مثبت پہلو:

ا- ایسے افراد کے لیے سہولت جو مکمل ازدواجی تعلقات کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوں۔

۲-معاشرے میں بے راہ روی کی روک تھام۔

۳-غیر روایتی نکاح کے ذریعے افراد کو ازدواجی سکون فراہم کرنا۔

زواجِ مسیار کے منفی پہلو:

۱- بیوی اور بچوں کے حقوق کی ممکنہ پامالی، خاص طور پر نفقہ اور سکونت کے حقوق۔

۲-معاشرتی عدم استحکام، کیونکہ ایسے نکاح میں عموماً استقرار کم ہوتا ہے۔

۳-سماجی اعتبار سے اس نکاح کو عمومی نکاح جیسا مقام نہیں دیا جاتا، جس سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

نتیجہ:

زواجِ مسیار شرعاً درست ہے، لیکن یہ صرف خاص حالات میں ہی اپنایا جائے تاکہ اس کے منفی اثرات سے بچا جا سکے۔ اس نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کے حقوق شرعاً محفوظ ہیں، اور والد پر ان کے نفقہ کی ذمہ داری لازم ہے۔

نکاح موقت کا حکم

سوال:(7)

بہت سے عرب طلبہ مغربی ملکوں میں جاتے ہیں اور ان کو اپنی تعلیم مکمل

کرنے کے لئے طویل عرصہ وہیں مقیم رہنا پڑتا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان ملکوں کا ماحول اتنا خراب ہے کہ ایک جوان شخص کا تجرد کے ساتھ پاکدامنی کی زندگی گزارنا بہت دشوار ہوتا ہے، ان حالات میں وہ وہاں نکاح کر لیتے ہیں، یہ نکاح ان کے لئے عفت و پاکدامنی کا ذریعہ بھی بنتا ہے، اوراس سے خاندانی زندگی کی سہولتیں بھی حاصل ہوتی ہیں، بہت سے نکاح کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ دس پندرہ سال جب تک اس ملک میں ان کا قیام رہے گا، وہ اس رشتے کو باقی رکھیں گئے اور جب وہاں سے ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو واپس ہوں گےتو طلاق دے کر رشتہ ختم کر دیں گے؛ تاکہ عورت کے لئے دوسرے نکاح میں کوئی دشواری نہ ہواور مرد کو بھی نئی زندگی شروع کرنے میں پریشانی نہ ہو؛ کیوں کہ اگر پہلے سے کوئی عورت نکاح میں ہوتو کوئی دوسری عورت عام طور پر اس سے نکاح کے لئے تیار نہیں ہوتی، کیا نکاح کی اس صورت پر نکاح موقت کا اطلاق ہوگا؟ اگر دل میں یہ بات رکھے ہوئے ہو کہ ایک مقررہ یا غیر مقررہ وقت کے بعد وہ اس رشتہ کو ختم کر دے گا تو کیا یہ نکاح موقت کے دائرہ میں آئے گا؟

جواب:(7)

نکاح مؤقت کا حکم:

فقہ حنفی کی روشنی میں نکاح موقت (یعنی وقتی نکاح، جس میں پہلے سے ہی ایک معین مدت کے بعد علیحدگی کی نیت ہو) باطل ہے۔ اگر نکاح کرتے وقت فریقین

کے درمیان یہ شرط رکھی جائے کہ نکاح ایک مقررہ وقت کے لیے ہوگا، تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اگر دل میں نیت ہو کہ ایک مخصوص یا غیر مخصوص وقت کے بعد طلاق دے دی جائے گی، تو یہ نیت نکاح کو فاسد نہیں بناتی، لیکن ایسی نیت کرنا شرعاً پسندیدہ عمل نہیں ہے، کیونکہ نکاح کے اصل مقاصد (یعنی دائمی رفاقت اور عفت و پاکدامنی) کے خلاف ہے۔

فقہی حوالہ:

امام ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولو تزوجها إلى مدة بطل النكاح عندنا ...لأن النكاح شرع على سبيل الدوام فلا يجوز مؤقتاً، كذا في الهداية" (فتح القدیر، کتاب النکاح، جلد ۳، ص: ۲۴۸)

یعنی: اگر نکاح مدت کے ساتھ مشروط کیا جائے تو وہ نکاح باطل ہوگا، کیونکہ نکاح دائمی رفاقت کے لیے مشروع ہوا ہے، اس لیے وقتی نکاح جائز نہیں۔

مزید وضاحت:

فقہ حنفی کے دیگر معتبر مصادر میں بھی یہ حکم بیان کیا گیا ہے:

"إذا أضمر الطلاق في نفسه عند التزوج ولم يصرح به، فالنكاح صحيح ...لكن هذا مكروه في الدين" (ردالمحتار، جلد ۳، ص: ۵۲)

یعنی: اگر دل میں طلاق دینے کی نیت ہو اور اسے ظاہر نہ کیا جائے، تو نکاح صحیح ہوگا، لیکن یہ نیت دین کے لحاظ سے مکروہ ہے۔

نتیجہ:

اگر نکاح کے وقت کوئی مدت کی شرط نہ رکھی جائے، لیکن دل میں وقت مقرر کرنے کی نیت ہو، تو نکاح موقت کے دائرے میں نہیں آئے گا، اور یہ نکاح فقہی طور پر صحیح ہوگا، مگر اس نیت کو شرعی نقطہ نظر سے ناپسندیدہ اور خلافِ اخلاق سمجھا جائے گا۔

نکاح مؤقت کی حقیقت اور ائمہ اربعہ کا موقف

سوال:(8)

اسی پس منظر میں دریافت طلب ہے کہ نکاح موقت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے حکم کے بارے میں ائمہ اربعہ اور صاحبین کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب:(8)

نکاحِ مؤقت (عارضی نکاح) ایک ایسا نکاح ہے جس میں کسی معین مدت کے لیے نکاح کی شرط رکھی جاتی ہے، مثلاً ایک مہینے، ایک سال یا کسی اور متعین وقت کے لیے۔ اس طرح کا نکاح شریعت میں ناجائز اور حرام ہے۔

فقہ حنفی کا موقف:

فقہ حنفی کے مطابق نکاح مؤقت باطل ہے، کیونکہ اس میں نکاح کے مقصود اصلی (دوام اور استحکام) کی نفی کی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ اس نکاح کو ناجائز اور غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''ہدایہ'' میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے:

"وإذا تزوجها إلى مدة، فالنكاح باطل عندنا" (ہدایہ، کتاب النکاح)

یہاں امام صاحب اور صاحبین کا موقف بالکل واضح ہے کہ اگر نکاح میں مدت کی شرط لگائی جائے تو نکاح باطل ہوگا۔

''الدر المختار'' میں ہے:

"النكاح المؤقت باطل لأنه ينافي المقصود من النكاح وهو الدوام والاستقرار" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب النکاح)

دیگر ائمہ کا موقف:

۱- امام مالک رحمہ اللہ:

امام مالک کے نزدیک بھی نکاح مؤقت باطل ہے اور اس میں فاسد شرط کی وجہ سے نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

''المدونۃ'' میں آیا ہے:

''**كل شرط في النكاح يفضي إلى الأجل فهو باطل**'' (المدونۃ الکبریٰ، کتاب النکاح)

۲- امام شافعی رحمہ اللہ:

امام شافعی بھی نکاح مؤقت کو باطل قرار دیتے ہیں، کیونکہ نکاح کی غرض دائمی رشتہ ہے نہ کہ وقتی۔

''الأم'' میں لکھا ہے:

''**النِّكَاحُ الْمُؤَقَّتُ مُحَرَّمٌ بِنَصِّ الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ**'' (الأم، کتاب النکاح)

۳- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

امام احمد کے نزدیک نکاح مؤقت جائز نہیں ہے اور یہ زنا کے مشابہ ہے۔

''المغنی'' میں ہے:

''**النكاح المؤقت يبطل العقد، لأنه ليس زواجًا مشروعًا**'' (المغنی لابن قدامۃ، کتاب النکاح)

قرآن وحدیث کی روشنی میں نکاحِ مؤقت کی حرمت:

اللہ تعالیٰ نے نکاح کو دوام اور استحکام کے ساتھ مشروع کیا ہے:

''**وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ**

بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً" (سورۃ الروم:21)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح مؤقت کو قیامت تک کے لیے حرام قرار دیا:

"نهى رسول الله عن نكاح المتعة يوم خيبر" (صحیح بخاری، کتاب النکاح)

امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول:

صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) بھی نکاح مؤقت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے موقف سے متفق ہیں اور اس کی حرمت پر زور دیتے ہیں۔

''مبسوط سرخسی'' میں آیا ہے:

"التزويج إلى أجلٍ لا يصح بالإجماع" (المبسوط للسرخسی، کتاب النکاح)

''الجامع الصغیر'' میں امام محمد فرماتے ہیں:

"إذا كان النكاح مؤقتا، فلا نكاح بينهما" (الجامع الصغیر لمحمد بن الحسن)

نتیجہ:

نکاح مؤقت ائمہ اربعہ کے نزدیک حرام اور باطل ہے، کیونکہ یہ نکاح کے مقاصد کے خلاف ہے۔ صاحبین کا قول بھی یہی ہے کہ نکاح مؤقت غیر معتبر ہے اور اسے جائز قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

دار القضاء کی آن لائن بعض کارروائیاں

مدعی کا آن لائن دعویٰ پیش کرنے کا حکم

سوال:(1)

دعویٰ کے لئے ضروری ہے کہ مدعی، قاضی یا اس کے نائب کی مجلس میں اپنا مدعا پیش کرے، اگر وہ کہیں اور اپنی شکایت رکھے تو یہ دعویٰ نہیں ہوگا، موجودہ حالات میں اگر دار القضاء کے آفس میں قاضی کو یا فریقین کو آنے سے منع کر دیا گیا ہو تو کیا مدعی آن لائن اپنا دعویٰ پیش کر سکتا ہے، اور اس کو مجلس قضاء میں حاضری تصور کیا جائے گا؟

جواب:(1)

مدعی کا قاضی یا اس کے نائب کی مجلس میں حاضر ہو کر اپنا دعوی پیش کرنا اصولاً ضروری ہے، کیونکہ فقہاء نے مجلس قضا میں دعوی کی شرط لگائی ہے تا کہ قاضی دعوی اور گواہوں کو سماعت کر سکے اور حق کے مطابق فیصلہ دے سکے۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم نے فرمایا:

”الدعوی: إظهار المدعی عند الحاکم طلب حقه من المدعی

علیہ" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج7،ص186)

تاہم، اگر غیر معمولی حالات (مثلاً کرونا وبا) کی وجہ سے فریقین یا قاضی کے لیے مجلس قضا میں حاضر ہونا ممکن نہ ہو، تو فقہاء نے ایسے حالات میں سہولت فراہم کرنے کا اصول بیان کیا ہے۔ موجودہ ٹیکنالوجی کے دور میں، آن لائن دعوی کو مجلس قضا میں پیش ہونے کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ قاضی، مدعی، اور مدعا علیہ سب آن لائن ایک ہی مجلس میں شامل ہوں اور قاضی تمام ضروری شواہد اور بیانات کا جائزہ لے سکے۔

فقہاء نے مجلس قضا کی تعریف میں یہ شرط بیان کی ہے کہ قاضی اور فریقین ایک وقت میں حاضر ہوں، جیسا کہ علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

"ولا بد من حضور الخصمين أو وكيليهما مع القاضي في مجلس القضاء" (الدر المختار مع رد المحتار، ج5،ص429)

موجودہ حالات میں مجلس قضا کا آن لائن انعقاد فقہ کے اس اصول سے مطابقت رکھتا ہے، بشرطیکہ مجلس کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

لہٰذا، کرونا یا دیگر رکاوٹوں کی بنا پر مدعی آن لائن اپنا دعوی پیش کر سکتا ہے اور اسے مجلس قضا میں حاضری تصور کیا جائے گا، بشرطیکہ قاضی اور دونوں فریقین کے مابین براہ راست رابطہ اور معاملے کی سماعت ممکن ہو۔

کیا مدعی علیہ آن لائن رفع الزام کرسکتا ہے؟

سوال:(2)

یہی سوال رفع الزام سے متعلق بھی ہے کہ کیا مدعی علیہ آن لائن رفع الزام کرسکتا ہے؟

جواب:(2)

فقہ حنفی کے اصول وقواعد کے مطابق رفع الزام (بری الذمہ ہونا) ایک ایسا عمل ہے جو عدالت میں یا گواہوں کے سامنے سرانجام دیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے مدعی علیہ ذاتی طور پر حاضر نہ ہو سکے، جیسے کرونا جیسی مجبوری، تو شریعت اس کے لیے سہولت فراہم کرتی ہے، بشرطیکہ اس کی عدمِ حاضری کی وجہ واقعی شرعی اور معقول ہو۔

آن لائن رفع الزام یا بری الذمہ ہونے کی حیثیت کا دارومدار دو شرائط پر ہے:

۱-وثوق اور تصدیق: آن لائن بیان معتبر ہوگا اگر اس کی تصدیق معتبر ذرائع سے کی جا سکے، مثلاً ویڈیو کانفرنسنگ یا دیگر ایسی صورتیں جن میں مدعی علیہ کی موجودگی اور اس کا بیان واضح ہو۔

۲-عدالت یا مجاز اتھارٹی کی منظوری: رفع الزام کے عمل کو تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عدالت یا مجاز شرعی اتھارٹی اسے تسلیم کرے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"ویعتبر فی الإقرار أن یکون فی مجلس القضاء أو بحضور الشهود الثقات إذا کان الغائب معتذراً بعذر معتبر" (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب الشہادات، ج3،ص306)

یعنی اقرار یا رفع الزام کے لیے ضروری ہے کہ وہ قاضی کے سامنے ہو یا قابل اعتماد گواہوں کی موجودگی میں سرانجام دیا جائے، بشرطیکہ غیر حاضری کسی شرعی معذوری کی وجہ سے ہو۔

مزید یہ کہ:

"کل ما یتعلق بحقوق العباد یعتبر فیه التوثق حسب الإمکان"

(بدائع الصنائع، ج6،ص195)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آن لائن رفع الزام معتبر ہوسکتا ہے اگر اس میں حقوق کی حفاظت اور وثوق کا اہتمام کیا گیا ہو۔

خلاصہ:

یہ ہے کہ کرونا کی وجہ سے آن لائن رفع الزام، اگر معتبر طریقے سے سرانجام دیا جائے اور عدالت یا گواہوں کے سامنے تصدیق ہو، تو شریعت اسے قبول کرتی ہے۔

کیا آن لائن گواہوں کی گواہی معتبر ہے؟

سوال:(3)

نیز یہی سوال گواہوں سے متعلق بھی ہے، جیسا کہ معلوم ہے: شاہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ قاضی کی مجلس میں حاضر ہو کر اپنا بیان دے، تو کیا اس کا آن لائن بیان دینا کافی ہو جائے گا؟

جواب:(3)

گواہوں کی گواہی شرعی طور پر معتبر ہونے کے لیے چند شرائط ہیں جن کا مکمل ہونا ضروری ہے، جن میں گواہ کا عدالت کے سامنے حاضر ہونا اور قاضی کے سامنے واضح اور بلا کسی دباؤ گواہی دینا شامل ہیں۔ تاہم، کرونا جیسی وبائی صورتحال میں، جب عدالت میں حاضری ممکن نہ ہو، تو فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا حل موجود ہے۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر گواہ کسی عذر کی وجہ سے قاضی کے سامنے حاضر نہ ہو سکیں تو ان کی گواہی دیگر ذرائع سے بھی لی جا سکتی ہے، بشرطیکہ ان ذرائع سے یقین کامل حاصل ہو جائے۔

مثال کے طور پر: علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"وَلَوْ لَمْ يُمْكِنْ الْحُضُورُ لِمَرَضٍ أَوْ مَشَقَّةٍ جَازَ الْإِشْهَادُ بِالْمَكْتُوبِ إِذَا أَمِنُوا التَّزْوِيرَ وَالتَّبْدِيلَ" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 269)

یعنی اگر گواہ بیماری یا مشقت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے تو ان کی گواہی لکھے ہوئے ذریعے سے بھی قبول کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ دھوکہ یا تحریف کا خطرہ نہ ہو۔

اسی طرح جدید دور میں فقہاء نے ٹیلیفون، ویڈیو کانفرنسنگ یا دیگر مواصلاتی ذرائع کے ذریعے گواہی کو بھی قبول کیا ہے، بشرطیکہ:

۱- گواہ کی شناخت یقینی ہو۔

۲- گواہی مکمل وضاحت اور اعتماد کے ساتھ دی جائے۔

۳- گواہی کی ریکارڈنگ محفوظ ہو تا کہ مستقبل میں اس کا جائزہ لیا جا سکے۔

اس ضمن میں فتاوی ہندیہ میں بھی ذکر ملتا ہے:

"وَتُقْبَلُ الشَّهَادَةُ عَنْ بُعْدٍ إِذَا كَانَتِ الْعَادَةُ مَضْبُوطَةً" (فتاوی ہندیہ، جلد 3، صفحہ 306)

لہٰذا، موجودہ وبائی حالات میں اگر گواہ عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتے اور ان کی شناخت اور گواہی کی صحت پر مکمل اعتماد ہو تو آن لائن گواہی کو معتبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ شرط ہے کہ قاضی یا دار القضاء اس بات کا یقین کر لے کہ گواہی میں کسی قسم کی دھوکہ دہی یا جعل سازی کا امکان نہیں ہے۔

کیا ویڈیو کال پر مقدمہ کے فریق اور گواہوں کو دیکھنا کافی ہوگا؟

سوال: (4)

یہ بھی ضروری ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ اور گواہان کی بہتر طور پر شناخت ہو؛

اسی لئے فقہاء نے مدعیہ، مدعی علیہا اور خاتون گواہان کا چہرہ بھی دیکھنے کی اجازت دی ہے؛ تا کہ ان کو اچھی طرح پہچان لیا جائے، تو کیا ویڈیو کال پر مقدمہ کے فریقوں اور گواہوں کو دیکھ لینا کافی ہوگا؟

جواب:(4)

فقہ حنفی میں گواہان کی شناخت کے لیے ان کا چہرہ دیکھنا یا پہچاننا ضروری ہے تا کہ ان کی شہادت معتبر قرار دی جا سکے۔ اسی بنیاد پر فقہاء نے ایسے مواقع پر خواتین گواہوں کا چہرہ دیکھنے کی بھی اجازت دی ہے جہاں شناخت کے بغیر معاملہ طے کرنا ممکن نہ ہو۔

ویڈیو کال کے ذریعے گواہان کو دیکھنا اور شناخت کرنا بظاہر کافی معلوم ہوتا ہے، لیکن فقہ حنفی کی روایتی کتب میں اس مخصوص صورت حال کا ذکر موجود نہیں کیونکہ یہ ایک جدید معاملہ ہے۔ البتہ فقہاء نے اصولی طور پر ایسے دلائل دیے ہیں جو اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے "بدائع الصنائع" میں فرمایا:

"وجه اعتبار العدالة والبصر ليتمكن من معرفتهم، فإن المعرفة بالمجلس لا تحصل إلا برؤيتهم" (بدائع الصنائع، کتاب القضاء، جلد ۶ ص ۲۷۶)

یعنی گواہان کی عدالت اور ان کی پہچان کے لیے دیکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان کو شناخت کرنے کا طریقہ یہی ہے۔

اسی طرح علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے ''البحر الرائق'' میں ذکر کیا ہے:

''یشترط فی الشهادة تعرف القاضی علی الشاهدین بوجوهما وصوتیهما'' (البحر الرائق، کتاب الشہادات، جلد ۵، ص ۵۴)

یہ اصول واضح کرتا ہے کہ چہرہ اور آواز دونوں کی شناخت ضروری ہے۔

ویڈیو کال کے ذریعے شناخت چونکہ جدید ذرائع میں شامل ہے اور اس میں چہرہ اور آواز دونوں موجود ہوتے ہیں، اس لیے یہ شناخت کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے۔ البتہ، مزید اطمینان اور اعتماد کے لیے بہتر یہ ہے کہ گواہان کو براہ راست مجلس میں دیکھا جائے تاکہ ہر قسم کا شک دور ہو سکے۔

زمین کا معائنہ ویڈیوفون کے ذریعہ کافی ہوگا؟

سوال:(5)

حقیت کے مقدمہ میں بعض اوقات سرزمین کے معائنہ کی ضرورت پیش آتی ہے؛ تاکہ اس مقام کی نوعیت قاضی پر اچھی طرح واضح ہوجائے، تو کیا ویڈیوفون کے ذریعہ ایسے مقامات کا معائنہ کافی ہوجائے گا؟

جواب:(5)

فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں جب کسی مقدمے میں زمین یا مقام کے معائنہ کی ضرورت پیش آئے تو قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علم وفیصلہ کی بنیاد

پر اس مقام کی حقیقت کو اچھی طرح جانچے۔ فقہ حنفی کی کتب میں اس امر کی وضاحت ملتی ہے کہ گواہی یا معائنہ کی بنیاد پر فیصلے کے لیے مقامِ نزاع کو قاضی یا اس کے مقرر کردہ شخص کا براہ راست دیکھنا معتبر ہے، تاکہ قاضی کو حقائق واضح طور پر معلوم ہو سکیں۔

تاہم، موجودہ دور میں جب ٹیکنالوجی ترقی کر چکی ہے، جیسے ویڈیو کالنگ یا ویڈیو ریکارڈنگ، تو اس کے ذریعے زمین یا مقام کا معائنہ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے قاضی پر مقام کی نوعیت مکمل طور پر واضح ہو جائے اور دھوکہ یا شکوک وشبہات کی گنجائش نہ رہے۔ یہ ایک جدید اجتہادی مسئلہ ہے، اور اس پر فقہاء نے عمومی قواعد کے مطابق فیصلہ دیا ہے۔

فقہ حنفی کی عبارت:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ولا یجوز للقاضی أن یحکم بعلمه فی الحدود والقصاص، أما فی غیرهما فله ذلک بشرط أن یکون علمه عن معاینه أو سماعٍ، فیقتصر علی ما یتحقق به الأمر“ (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب القضاء، ج5، ص409، دار الفکر)

یعنی قاضی حدود وقصاص کے علاوہ معاملات میں اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے، بشرطیکہ علم براہ راست معائنہ یا سماعت کے ذریعے حاصل ہوا ہو۔

ویڈیو معائنہ کا اعتبار:

ویڈیو کال یا ریکارڈنگ کے ذریعے معائنہ فقہ حنفی کی روح کے مطابق

براہ راست معائنہ کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے، اگر اس سے مقصد پورا ہو رہا ہو اور قاضی کو حقائق واضح طور پر سمجھ آ جائیں۔ تاہم، اس پر مکمل انحصار کرتے وقت احتیاط ضروری ہے، کیونکہ یہ براہ راست مشاہدہ کا متبادل نہیں بن سکتا۔

خلاصہ:

ویڈیو فون کے ذریعے زمین یا مقام کا معائنہ بعض صورتوں میں کافی ہو سکتا ہے، لیکن یہ فیصلہ قاضی کی صوابدید اور معائنے کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر قاضی کو اس ذریعے سے حقیقت واضح ہو جائے اور شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے، تو یہ کافی ہو سکتا ہے۔

سامان کا مشاہدہ آن لائن معتبر ہوگا؟

سوال:(6)

فریقین بعض دفعہ ثبوت کے طور پر وثائق یا سامان بھی دار القضاء میں پیش کرتے ہیں، جیسے: نکاح نامہ، طلاق نامہ، تقسیم نامہ، یا مورث کے ترکہ کے بارے میں اختلاف ہو تو زیورات وغیرہ، کیا قاضی ان چیزوں کے آن لائن مشاہدہ پر اکتفا کر سکتا ہے؟

جواب:(6)

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقدمات کے

فیصلے میں حقائق کا یقین اور اطمینان حاصل کرے۔ اگر کوئی وثائق یا سامان بطورِ ثبوت پیش کیا جاتا ہے، تو قاضی کے لیے اس کا مشاہدہ بذاتِ خود کرنا ضروری ہے تاکہ وہ دلائل اور شواہد کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ آن لائن مشاہدہ اگرچہ ممکن ہے، لیکن صرف اس پر اکتفا کرنا اس وقت جائز ہوگا جب آن لائن مشاہدہ کے ذریعے مکمل اطمینان حاصل ہو اور کسی قسم کے دھوکہ یا جعل سازی کا امکان نہ ہو۔

فقہی حوالہ:

فقہ حنفی کی کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ولا يجوز للقاضي أن يحكم بمجرد السماع، بل لابد له من التحقق من الشهود وما يقدم إليه من وثائق، لأن الحكم بالظن ليس بجائز، بل باليقين" (الفتاوی الہندیۃ، ج3، ص303)

اسی طرح ردالمحتار میں بیان کیا گیا:

"ينبغي للقاضي أن يباشر المعاينة بنفسه إذا كان الأمر متعلقا بالحقوق الثابتة بأعيانها، ولا يعتمد على النقل أو الإشهاد إلا بعد التأكد"

(ردالمحتار، ج5، ص423)

اس عبارت سے واضح ہے کہ قاضی کے لیے براہ راست مشاہدہ ضروری ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو آن لائن مشاہدہ اس وقت قابل قبول ہوگا جب وہ دھوکہ دہی کے امکانات کو ختم کر دے اور یقین کی حد تک معاملے کو سمجھ لے۔

آن لائن کارروائی کی صورت میں ویڈیو کے ذریعہ حکم جاری کرنا کافی ہوگا؟

سوال:(7)

عام طور پر دارالقضاء سے تحریری شکل میں فریقین کو احکام بھیجے جاتے ہیں، اوراس کا پوسٹل ثبوت محفوظ رکھا جاتا ہے، کیا آن لائن کارروائی کی صورت میں فون یا ویڈیو کے ذریعہ حکم جاری کرنا اوراس کے ریکارڈ کو محفوظ کردینا کافی ہوسکتا ہے؟

جواب:(7)

دارالقضاء میں فریقین کو احکام تحریری شکل میں ارسال کرنے کا مقصد حکم کی قانونی حیثیت کو مضبوط بنانا اوراس کی محفوظ دستاویزی شہادت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ فقہ حنفی میں شرعی فیصلوں کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ حکم عدل وانصاف کے ساتھ، شواہد کے مطابق اور فریقین کی موجودگی میں دیا جائے تاکہ کسی بھی قسم کی غلط فہمی یا نزاع پیدا نہ ہو۔

آن لائن کارروائی کی صورت میں فون یا ویڈیو کے ذریعے احکام جاری کرنے کا مسئلہ عصر حاضر میں پیش آنے والی جدید ضروریات سے متعلق ہے۔اصولی طور پر اگر:

۱-فریقین کی موجودگی اور رضامندی فون یا ویڈیو کے ذریعے یقینی بنائی جائے۔

۲-دلائل اور شواہد واضح طور پر ریکارڈ کیے جائیں۔

۳-ریکارڈ محفوظ رکھا جائے تاکہ آئندہ کسی بھی تنازع کی صورت میں اسے بطور ثبوت پیش کیا جاسکے۔

۴-فیصلے کی شفافیت اور عدل پر کوئی اثر نہ پڑے۔

تو یہ طریقہ قابل قبول ہوسکتا ہے۔فقہاء کے اقوال میں اصولی رہنمائی درج ذیل ہے:

حوالہ:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"والحکم یلزم بحضور الخصمین وسماع البینۃ وقبولھا والحکم علیھا بما یطابق الشرع" (ردالمحتار، کتاب القضاء، جلد 5، صفحہ 381)

یعنی حکم اس وقت لازم ہوتا ہے جب قاضی فریقین کی موجودگی میں گواہوں کے بیانات کو سنے، ان کو قبول کرے اور شرع کے مطابق ان پر فیصلہ صادر کرے۔

مزید وضاحت:

عصر حاضر میں، آن لائن سہولیات کے ذریعے کارروائی کو جائز قرار دینے کے لیے فقہاء نے شرط عائد کی ہے کہ وہی اصول، یعنی:

گواہان کی شہادت

فریقین کی شرکت

ثبوت و دلائل کی جانچ

آن لائن طریقے میں بھی مکمل طور پر پایا جائے۔

لہٰذا اگر فون یا ویڈیو کے ذریعے دیے جانے والے حکم کی تمام شرعی اور قانونی شرائط پوری ہوں، اور اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے، تو یہ فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق کافی ہوسکتا ہے۔

صرف آڈیو کال کے ذریعہ مدعی، مدعی اعلیہ کی گواہی کی اعتباریت کا حکم

سوال:(8)

آن لائن سماعت اور بیان وغیرہ سے متعلق مذکورہ بالا سوالات ویڈیو کالنگ کی صورت سے متعلق ہیں، اگر بغیر ویڈیو کے ان ہی امور کو آڈیو کال پر انجام دیا جائے تو کیا اس کی گنجائش ہوگی؟

جواب:(8)

آن لائن سماعت یا بیان وغیرہ کو آڈیو کال کے ذریعہ انجام دینا اگرچہ ویڈیو کال کے مقابلے میں بہتر اور کم خرابیوں کا حامل ہے، لیکن اس کے جواز و عدم جواز کا مدار اصل مسئلے کی نوعیت اور شریعت کے اصولوں پر ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں اگر آن لائن سماعت کے دوران آڈیو کال پر ایسے امور انجام دیے جائیں جو گواہی یا عقد و نکاح وغیرہ سے متعلق ہوں، تو اس کے لیے درج ذیل اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہیں:

۱- تحققِ شہادت: گواہوں کی شناخت اور ان کے الفاظ کا مکمل یقین ہونا ضروری ہے۔ آڈیو کال میں صرف آواز پر اعتماد کرنا معتبر نہیں ہوگا، کیونکہ آواز میں شبہ کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور فقہ حنفی میں شہادت کے لیے قطعی یقین ضروری ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لَا تُقْبَلُ شَهَادَةٌ مَعَ الشَّكِّ فِيهَا، إِذَا لَمْ يَكُنْ قَطْعِيًّا" (ردالمحتار، کتاب الشہادات، جلد 5، صفحہ 400)

۲- مجلس کی وحدت: عقد یا گواہی کے لیے مجلس کی وحدت شرط ہے۔ آڈیو کال میں چونکہ مجلس حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی، بلکہ ایک فرضی مجلس ہوتی ہے، اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَشَرْطُ صِحَّتِهِ وَاحِدَةُ الْمَجْلِسِ وَسَمَاعُ الْإِيجَابِ وَالْقَبُولِ بِطَرِيقٍ لَا يَشُكُّ فِيهِ" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 99)

۳- خدشۂ تزویر و دھوکہ: آڈیو کال میں دھوکہ دہی اور جعلسازی کا امکان موجود ہے، جبکہ شریعت ان معاملات میں قطعی شفافیت کی تاکید کرتی ہے۔

نتیجتاً، فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کی روشنی میں آڈیو کال پر گواہی، نکاح یا دیگر

شرعی معاملات کو انجام دینا درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ شہادت اور مجلس کی شرائط کو پورا نہیں کرتا اور احتمالِ شک باقی رہتا ہے۔

آن لائن اقرار کا حکم

سوال:(9)

قضاء کی ایک بنیاد اقرار بھی ہے اور اقرار بھی وہی معتبر ہے جو قاضی کے سامنے ہو، تو کیا قاضی کو خطاب کرتے ہوئے آن لائن اقرار کرنا قاضی کے سامنے اقرار کرنے کے مماثل ہوگا؟

جواب:(9)

آن لائن اقرار کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقرار کی حیثیت اور اس کے شرعی اعتبار پر غور کیا جائے۔ فقہ حنفی میں قضاء کے باب میں اقرار کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ قاضی کے سامنے ہو اور قاضی اس کو سن اور سمجھ سکے۔ اقرار کی تعریف امام کاسانیؒ نے یوں کی ہے:

"هو إخبار عن حق لزم من جهة نفسه" (بدائع الصنائع، جلد ۶، صفحہ ۲۰۰، دار الکتب العلمیۃ)

یعنی اقرار ایک شخص کا اپنے ذمے کسی حق کے لازم ہونے کی خبر دینا ہے۔

قاضی کے سامنے اقرار کی شرط:

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

"الاقرار إذا كان بحضرة الحاكم فإنه يثبت الحق قطعاً" (فتح القدیر، جلد ۵، صفحہ ۳۰۷، دار الکتب العلمیۃ)

یعنی قاضی کے سامنے اقرار حق کو قطعی طور پر ثابت کرتا ہے۔

آن لائن اقرار کی حیثیت:

آج کل کے دور میں جب آن لائن مواصلاتی ذرائع نے قاضی اور مقر کے درمیان فاصلہ ختم کر دیا ہے، تو اگر آن لائن اقرار واضح طور پر ویڈیو کانفرنسنگ یا کسی ایسے ذریعے سے کیا جائے جس میں قاضی اقرار کو سن اور دیکھ سکے، تو فقہاء کے اصولوں کی روشنی میں اسے "قاضی کے سامنے اقرار" کے برابر تسلیم کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ قاضی کو یقین ہو جائے کہ اقرار کرنے والا خود وہی شخص ہے اور اس پر کوئی جبر نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"والمراد من الحضور ما يتيقن به القاضي تحقق الإقرار سواء كان بنفسه أو بواسطة موثوقة" (ردالمحتار، جلد ۵، صفحہ ۴۰۲، دار الفکر)

یعنی قاضی کے سامنے ہونے سے مراد وہ صورت ہے جس سے قاضی کو اقرار کی تصدیق حاصل ہو جائے، خواہ براہِ راست ہو یا کسی معتبر ذریعے سے۔

لہٰذا فقہ حنفی کی روشنی میں اگر آن لائن اقرار ایسے ذرائع سے ہو جہاں قاضی اقرار کو براہِ راست سن سکے اور مقر کی شناخت میں کوئی شبہ نہ ہو، تو یہ "قاضی کے سامنے اقرار" کے حکم میں آئے گا

دار القضاء کی کارروائی اگر آن لائن بھی ممکن نہ ہو پھر قاضی کیا کرے؟

سوال:(10)

مذکورہ بالا تمام سوالات ان حالات سے متعلق ہیں جب کرونا جیسی وبا کی وجہ سے دار القضاء کی کارروائی معمول کے مطابق نہیں چل سکتی، اگر اس طرح کے حالات میں بھی دار القضاء کی کارروائیاں آن لائن انجام نہیں پاسکتیں تو سوال یہ ہے کہ قاضی قیام عدل، رفع ظلم اور دفع نزاع کا فریضہ کس طرح انجام دے گا؟ کیا وہ ان حالات میں معطل رہے گا، یا اپنی بعض ذمہ داریاں کسی شکل میں ادا کرے گا؟

جواب:(10)

کرونا جیسی وبا کی صورت میں جب دار القضاء کی روایتی کاروائیاں معطل یا مشکل ہو جائیں، تو قاضی کا فریضہ قیام عدل، رفع ظلم اور دفع نزاع کا ہے۔ فقہ حنفی میں بھی یہ تصور موجود ہے کہ جب حالات میں کوئی غیر معمولی حالت پیش آئے، تو شریعت کی اجازت سے بعض اقدامات اختیار کیے جا سکتے ہیں تا کہ عدلیہ کا نظام فعال رہے اور حقوق کے تحفظ کا عمل جاری رہے۔

فقہ حنفی میں قاضی کے فرائض اور غیر معمولی حالات

فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں قاضی کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ان کتابوں میں درج اہم نکات کو پیش کیا جا تا ہے:

ا-کفایت اور ضرورت کے مطابق فیصلے کرنا:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب الہدایہ میں درج ہے کہ قاضی جب کسی مقدمے کا فیصلہ کرتا ہے،تو وہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ عدلیہ کے ادارے کا مقصد پورا ہو۔اگر حالات کی شدت کی وجہ سے کوئی عام طریقہ کار ممکن نہیں ہوتا،تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو کسی ممکنہ اور قابل عمل شکل میں ادا کرے، جیسے کہ آن لائن سماعت یا کسی غیر رسمی فورم کے ذریعے تنازعات کا حل۔

الہدایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ قاضی کو فتنہ اور فساد سے بچنے کے لیے مؤثر طریقے اختیار کرنا ضروری ہے:

”قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل قائم کرے اور فساد کو ختم کرے، اور اگر حالات ایسے ہوں کہ رسمی عدلیہ کی کاروائی ممکن نہ ہو،تو وہ دیگر طریقوں کو اپنائے“

(الہدایہ 3/99)۔

۲-دفع ظلم اور قیام عدل:

امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی کتاب المبسوط میں بیان کیا گیا ہے کہ قاضی کے

لیے ضروری ہے کہ وہ ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کی کوشش کرے، چاہے اس کے لیے غیر روایتی طریقے ہی کیوں نہ اختیار کیے جائیں:

''قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظالم کو روکنے اور مظلوم کا حق دلوانے کے لیے جتنی تدابیر ممکن ہوں، وہ اختیار کرے'' (المبسوط 8/213)۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر وبا کی وجہ سے عدالت میں فزیکلی سماعت ممکن نہ ہو، تو قاضی کو دیگر طریقوں سے اس فریضے کو ادا کرنا چاہیے۔

۳۔تعطیل کی صورت میں احتیاطی تدابیر:

الدر المختار میں بھی اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ غیر معمولی حالات میں قاضی کی ذمہ داری معطل نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ اپنے منصب پر برقرار رہتے ہوئے مختلف تدابیر سے عدلیہ کے عمل کو جاری رکھے گا:

''اگر قاضی کی عدالت میں حالات کی شدت کی وجہ سے سماعت ممکن نہ ہو تو اس پر لازمی ہے کہ وہ فیصلے کرنے کے دوسرے متبادل طریقے اختیار کرے'' (الدر المختار 4/252)۔

لائحہ عمل اور خاکہ شرعی حدود میں:

اگر دار القضاء کی کارروائیاں آن لائن انجام نہیں دے پاتیں تو قاضی کی طرف سے ضروری اقدامات کیے جاسکتے ہیں:

ویڈیو کانفرنسنگ یا آڈیو کانفرنسی نظام: یہ ایک قابل عمل طریقہ ہوسکتا ہے جس

سے فریقین کے بیانات سنے جاسکتے ہیں اور فیصلے دیے جاسکتے ہیں۔

تحریری فیصلے: اگر فریقین کا براہ راست رابطہ مشکل ہو، تو فیصلے تحریری طور پر تیار کر کے فریقین کو ارسال کیے جاسکتے ہیں۔

مفاہمت اور صلح کا عمل: قاضی کی جانب سے مصلحت یا صلح کی کوششیں بھی اہم ہوں گی، اور اس کے لیے فریقین کو خطوط یا دیگر ذرائع سے مشاورت کی جاسکتی ہے۔

ثالثی کا اختیار: جیسے فقہ حنفی میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قاضی کی عدم موجودگی میں یا مخصوص حالات میں ثالثی کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔

اختتامیہ:

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی کا فریضہ کبھی معطل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے مختلف تدابیر اپنانا ضروری ہوتا ہے تاکہ عدلیہ کا عمل جاری رکھا جاسکے اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے۔

ورچول کرنسی سے متعلق شرعی احکام

کیا ورچول کرنسی کو ثمن اصطلاحی قرار دیا جاسکتا ہے؟

سوال:(1)

فی زمانہ ورچول کرنسی کا استعمال بڑھ رہا ہے، تو جیسے سونے کی جگہ کاغذی کرنسی کو بتدریج بعینہ ثمن مان لیا گیا؛ حالاں کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کی کوئی قابل ذکر قیمت نہیں ہے، کیا اسی طرح ورچول کرنسی کو موجودہ حالات میں ثمن اصطلاحی قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب:(1)

ورچول کرنسی (Virtual Currency) جیسے بِٹ کوائن اور دیگر ڈیجیٹل کرنسیوں کا مسئلہ فی زمانہ ایک نیا اور پیچیدہ مسئلہ ہے، جس پر علماء کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کو فقہ حنفی کی روشنی میں سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ثمن اصطلاحی کی تعریف کو مدنظر رکھنا ہوگا، اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ورچول کرنسی اس تعریف پر پورا اترتی ہے یا نہیں۔

فقہ حنفی میں ثمن کی تعریف:

فقہ حنفی کی مستند کتاب ہدایہ میں مذکور ہے:

والثمن ما یرغب فیه لاجل المال، ویتمول فی کل مکان و زمان بغیر استثناء، وھو الذی ینطبع بطبع المال المطلق کالذھب و الفضة۔ (ہدایہ، کتاب البیوع)

یعنی ثمن وہ چیز ہے جسے مال کے بدلے استعمال کیا جائے اور جو ہر زمان ومکان میں قدر و قیمت کے طور پر معتبر ہو، جیسے سونا اور چاندی۔

کاغذی کرنسی کو فقہاء نے اس وقت ثمن قرار دیا جب حکومتوں نے اسے قانونی حیثیت دی اور عوام نے اسے قابل قبول سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے فقہ حنفی میں ثمن عرفی کا درجہ حاصل ہوا۔

ورچول کرنسی اور ثمن اصطلاحی کا اطلاق:

ورچول کرنسی کو ثمن اصطلاحی ماننے میں درج ذیل چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں:

۱۔حکومتی تائید:

کاغذی کرنسی کے برعکس ورچول کرنسی کو اکثر ممالک میں مکمل قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ بعض ممالک میں اسے تسلیم کیا گیا ہے، لیکن عمومی سطح پر یہ حکومتوں کی

ضمانت اور تحفظ سے محروم ہے۔

۲-عوامی قبولیت:

ثمن عرفی یا اصطلاحی بننے کے لیے کسی چیز کا عوامی طور پر قبول کیا جانا ضروری ہے۔ ورچول کرنسی ابھی تک محدود طبقے میں مقبول ہے اور ہر جگہ قابل قبول نہیں۔

۳-عدم استقرار:

ورچول کرنسی کی قیمت میں شدید اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، جو اسے مستحکم ثمن بننے سے روکتا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے ثمن میں استقرار اور اعتماد کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ سونا، چاندی یا کاغذی کرنسی میں ہوتا ہے۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کی روشنی میں موجودہ حالات میں ورچول کرنسی کو ثمن اصطلاحی یا ثمن عرفی قرار دینا دشوار ہے، کیونکہ:

۱-اسے عالمی سطح پر قانونی اور معاشرتی حیثیت حاصل نہیں۔

۲-اس میں استقرار اور اعتبار کی کمی ہے۔

۳-حکومتوں کی ضمانت شامل نہیں۔

اس لیے ورچول کرنسی کو تجارت یا لین دین کے لیے استعمال کرنا اس وقت تک شرعاً درست نہیں جب تک کہ اس پر واضح اور مستند شرعی حکم جاری نہ ہو جائے اور

اس کی حیثیت ثمن کے طور پر عالمی سطح پر مستحکم نہ ہو جائے۔

کیا کسی چیز کے کرنسی ہونے کے لئے حکومت کا تسلیم کرنا ضروری ہے؟

سوال:(2)

کیا کسی چیز کے کرنسی ہونے کے لئے حکومت کا اسے تسلیم کرنا ضروری ہے، اور اگر ڈیجیٹل کرنسی کو کوئی ملک سرکاری طور پر ثمن تسلیم کر لے تو کیا اس کو ثمن کا درجہ حاصل ہو جائے گا؟

جواب:(2)

کسی چیز کے کرنسی (ثمن) ہونے کے لیے حکومت کا اسے تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن فقہ حنفی کی روشنی میں کرنسی کے معتبر ہونے کے لیے عوامی قبولیت (عرف عام) اور قیمت کے تعین میں استقرار بنیادی شرائط ہیں۔ اگر حکومت کسی چیز کو کرنسی کے طور پر تسلیم کر لے، تو یہ اس کی قبولیت میں مددگار بن سکتی ہے، لیکن اصل مدار عرف عام پر ہوگا، جو حکومت کی تائید کے بغیر بھی ممکن ہے۔

فقہ حنفی میں عرف اور ثمن کی حیثیت:

فقہ حنفی میں عرف کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

الثمن قد یکون فی الاصل ثمنًا کالذھب و الفضة، و قد یصیر ثمنًا بجعل الناس و إصطلاحھم کالفلوس (بدائع الصنائع، ج5،ص153)

یعنی ثمن وہ چیز ہے جو اپنی اصل میں ثمن ہو، جیسے سونا اور چاندی، یا وہ چیز جسے لوگ اصطلاح اور عرف کے ذریعے ثمن بنالیں، جیسے فلوس (پرانے زمانے کے سکے)۔

یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ کسی چیز کے ثمن بننے کے لیے عوام کی قبولیت بنیادی شرط ہے، جبکہ حکومت کی تائید اس عرف کو مزید مضبوط کرتی ہے۔

حکومت کی تائید اور ڈیجیٹل کرنسی کا مسئلہ:

اگر کوئی حکومت ڈیجیٹل کرنسی کو قانونی طور پر تسلیم کرلے اور عوام میں اسے کرنسی کے طور پر استعمال کرنے کا عرف عام بن جائے، تو فقہ حنفی کی روشنی میں یہ ثمن عرفی کا درجہ حاصل کرسکتی ہے۔ لیکن اگر صرف حکومت تسلیم کرے اور عوام میں قبولیت نہ ہو، تو یہ کرنسی کے درجے پر فائز نہیں ہوگی۔

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

فلوس إنما تکون أثمانًا بالتعامل لا بنفسھا، لأنھم جعلوھا ثمناً للضرورة فی بعض المواضع (المبسوط، ج12،ص18)

یعنی فلوس (نقدی سکوں) کو خود ان کی ذات کی وجہ سے نہیں، بلکہ عرف اور تعامل کی وجہ سے ثمن بنایا گیا۔

یہ اصول ڈیجیٹل کرنسی پر بھی منطبق ہوتا ہے:

اگر حکومت اسے قانونی حیثیت دے اور عوام اسے کرنسی کے طور پر قبول کریں، تو یہ فقہ حنفی میں ثمن بن سکتی ہے۔

لیکن صرف حکومت کی تائید کافی نہیں ہوگی، جب تک عوام اسے باقاعدہ لین دین میں استعمال نہ کریں۔

خلاصہ:

۱-کسی چیز کے کرنسی ہونے کے لیے حکومت کی تسلیم ضروری نہیں، لیکن اس کی عرفی حیثیت اہم ہے۔

۲-اگر کوئی حکومت ڈیجیٹل کرنسی کو قانونی حیثیت دے اور عوام میں اس کا تعامل عام ہو جائے، تو یہ ثمن عرفی بن سکتی ہے۔

۳-حکومت اور عوام کی مشترکہ قبولیت سے ہی کسی چیز کو کرنسی کا شرعی درجہ ملتا ہے۔

ڈیجیٹل کرنسی پر وجوب زکوۃ کا حکم

سوال:(3)

جن لوگوں نے ڈیجیٹل کرنسی حاصل کر رکھی ہے، کیا ان کے حق میں اس کی حیثیت مال کی ہوگی، اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، میراث جاری ہوگی اور اس کے ذریعہ خرید وفروخت درست ہوگی، اسی طرح مال سے متعلق دوسرے احکام اس پر نافذ ہوں گے؟

جواب:(3)

ڈیجیٹل کرنسی جیسے بٹ کوائن اور دیگر ورچول کرنسیوں کی حیثیت اور اس سے متعلق احکام کا تعین فقہ حنفی کی روشنی میں کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مال کی تعریف کیا ہے اور کیا یہ کرنسی اس تعریف پر پورا اترتی ہے؟

فقہ حنفی میں مال کی تعریف:

فقہ حنفی کے مطابق مال وہ چیز ہے:

۱-جو قابل انتفاع ہو۔

۲-جس کی شرعی طور پر ملکیت ممکن ہو۔

۳-جسے محفوظ کیا جا سکے اور جس سے عرف عام میں فائدہ حاصل کیا جاتا ہو۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

کل مایمکن إحرازه والانتفاع به عادة فهو مال (بدائع الصنائع، ج5،ص145)

یعنی ہر وہ چیز جسے محفوظ کیا جا سکے اور عام طور پر اس سے فائدہ حاصل کیا جائے، وہ مال ہے۔

ڈیجیٹل کرنسی اور مال کی حیثیت:

ڈیجیٹل کرنسی، جیسے بٹ کوائن، ان خصوصیات پر جزوی طور پر پورا اترتی ہے:

۱-قابل انتفاع ہونا: ڈیجیٹل کرنسی کو آن لائن خریداری اور سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ قابل انتفاع ہے۔

۲-محفوظ کرنے کی صلاحیت: اسے ڈیجیٹل والٹ میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

۳-عرف میں قبولیت: کچھ ممالک اور تجارتی حلقوں میں اسے محدود پیمانے پر قبول کیا جارہا ہے، لیکن اس کی عمومی حیثیت ابھی غیر مستحکم ہے۔

فقہ حنفی میں انفرادی احکام:

۱-مال ہونے کی حیثیت:

اگر کسی کے پاس ڈیجیٹل کرنسی موجود ہے اور وہ اسے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو اس پر مال کی تعریف کا اطلاق ہوگا، لیکن یہ مال متقوم ہوگا یا نہیں، یہ اس کے عرف عام اور شرعی جواز پر منحصر ہے۔

۲-زکوٰۃ کا حکم:

فقہ حنفی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مال کا متقوم اور نصاب کے برابر ہونا ضروری ہے۔

اگر ڈیجیٹل کرنسی عرف عام میں مال متقوم تسلیم کرلی گئی ہے اور اس کی قیمت نصاب (ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا) کے برابر یا اس سے زیادہ ہو، تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لیکن اگر یہ عرف میں مکمل طور پر مستحکم نہ ہو، تو زکوٰۃ کا حکم مشتبہ ہوگا۔

۳-میراث کا حکم:

ورثاء کے درمیان تقسیم کے لیے ضروری ہے کہ اس مال کو شریعت میں جائز اور قابل ملکیت سمجھا جائے۔

اگر ڈیجیٹل کرنسی عرف اور حکومت کے لحاظ سے جائز مال ہو، تو میراث میں اس کا حصہ دیا جائے گا۔

اگر اس کی حیثیت متنازع ہو، تو ورثاء کو اس سے احتیاط کرنی چاہیے۔

۴-خرید وفروخت کا حکم:

خرید وفروخت کے لیے ضروری ہے کہ مال:

۱-شرعاً جائز ہو۔

۲-دھوکہ دہی اور غرر سے پاک ہو۔

ڈیجیٹل کرنسی کے ساتھ غرر (uncertainty) اور اتار چڑھاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے ذریعے خرید وفروخت سے اجتناب بہتر ہے، جب تک کہ اس کے احکام واضح نہ ہوں۔

۵-دیگر مالی احکام:

مال سے متعلق دیگر احکام بھی اس پر اس وقت نافذ ہوں گے جب اسے

عرف اور شریعت میں مکمل طور پر مال تسلیم کرلیا جائے۔

فقہی حوالہ:

فقہ حنفی میں مال اور اس کے استعمال سے متعلق اصول المبسوط میں بیان ہوئے ہیں:

کل ما کان مالاً یصلح للتعامل، فإنه یدخل فی حکم الأموال التی یجری فیها الإرث والزکاة (المبسوط، ج2، ص200)

یعنی ہر وہ چیز جو مال ہو اور معاملہ میں استعمال ہو سکے، اس پر میراث اور زکوٰۃ کے احکام لاگو ہوں گے۔

خلاصہ:

۱- ڈیجیٹل کرنسی مال کی تعریف پر جزوی طور پر پورا اترتی ہے، لیکن اس کی حیثیت متقوم مال کی تبھی ہوگی جب عرف اور شریعت میں اس کی قبولیت عام ہو جائے۔

۲- زکوٰۃ، میراث اور دیگر مالی احکام اسی صورت لاگو ہوں گے جب یہ مستحکم اور شرعی طور پر جائز مال ثابت ہو۔

۳- موجودہ صورت حال میں اس کے ذریعے خرید و فروخت اور مالی معاملات میں احتیاط کرنا بہتر ہے۔

کیا ورچول کرنسی کے ذریعہ سرمایہ کاری جائز ہے؟

سوال:(4)

کیا ورچول کرنسی کے ذریعہ سرمایہ کاری کرنا اور اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہوگا یا غیر معمولی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے یہ قمار کے دائرہ میں آجائے گا؟

جواب:(4)

ورچول کرنسی (ڈیجیٹل کرنسی) کے ذریعے سرمایہ کاری اور نفع حاصل کرنے کے جواز یا عدم جواز کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے، خاص طور پر یہ کہ کیا اس میں غرر (غیر یقینی صورت) اور قمار (جوا) کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔فقہ حنفی میں سرمایہ کاری اور تجارت کے لیے چند بنیادی اصول ہیں، جن کی روشنی میں ورچول کرنسی کے معاملے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

فقہ حنفی میں غرر اور قمار کی ممانعت:

فقہ حنفی میں غرر اور قمار کے بارے میں اصولی بات یہ ہے کہ ہر ایسا معاملہ جس میں:

۱-غیر یقینی نفع ونقصان ہو۔

۲-طرفین میں سے کسی ایک کے لیے ناحق نقصان کا احتمال ہو۔

۳-سرمایہ مکمل خطرے میں ہو اور اس کی حفاظت کی ضمانت نہ ہو۔

ایسے معاملات شرعاً ناجائز قرار دیے گئے ہیں۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

وكل بيع كان فيه مخاطرة وغرر فهو محظور، لأنه يؤدي إلى أكل المال بالباطل (بدائع الصنائع، ج5، ص153)

یعنی ہر وہ بیع جس میں خطرہ یا دھوکہ ہو، وہ ممنوع ہے، کیونکہ یہ ناجائز طور پر مال کھانے کا سبب بنتی ہے۔

ورچول کرنسی اور قمار کی خصوصیات:

ورچول کرنسی میں درج ذیل پہلو قابل غور ہیں:

۱-غیر معمولی اتار چڑھاؤ:

ورچول کرنسی کی قیمت میں شدید اتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، جو اس کے ذریعے سرمایہ کاری کو جوے کے قریب کر دیتا ہے۔فقہ حنفی میں ایسی سرمایہ کاری ناجائز ہے جس میں مال بغیر کسی حقیقی وجہ کے بڑھنے یا کم ہونے کا خطرہ ہو۔

۲-عدم استحکام:

ورچول کرنسی کا کوئی مادی وجود نہیں ہے اور یہ صرف مارکیٹ کے رجحان پر منحصر ہے۔اس کی قیمت کے تعین میں حقیقی اثاثے یا پیداوار کا کوئی عمل دخل نہیں، جو

اسے غرر کے زمرے میں لے آتا ہے۔

۳-قانونی اور شرعی تحفظ کی کمی:

فقہ حنفی میں مال کی حفاظت اور قانونی تحفظ ایک بنیادی شرط ہے۔ ورچول کرنسی میں اکثر دھوکہ دہی اور ہیکنگ کے معاملات سامنے آتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ سرمایہ کاری محفوظ نہیں۔

۴-قیاس قمار پر:

ورچول کرنسی کے ذریعے سرمایہ کاری میں اکثر معاملات قیاساً قمار کے مشابہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس میں نفع یا نقصان کا انحصار محض قیمت کے اتار چڑھاؤ پر ہوتا ہے، جسے شرعی طور پر جائز تجارت نہیں کہا جا سکتا۔

فقہی اصول کے تحت حکم:

ورچول کرنسی کے ذریعے سرمایہ کاری کرنا اور نفع حاصل کرنا فقہ حنفی کے درج ذیل اصولوں کے خلاف ہے:

۱-غرر: کیونکہ اس کی قیمت میں شدید غیر یقینی ہے۔

۲-قمار: کیونکہ اس میں نفع یا نقصان کا انحصار کسی حقیقی پیداوار کے بجائے محض قیاس آرائی پر ہوتا ہے۔

۳-أکل مال بالباطل: اس طرح کی سرمایہ کاری میں نفع کا حصول اکثر

دوسرے فریق کے نقصان پر مبنی ہوتا ہے، جو شریعت میں ناجائز ہے۔

حوالہ:

فقہ حنفی کی کتاب المبسوط میں بیان ہے:

كل بيع كان الغالب فيه الغرر و عدم العلم بما يقع عليه العقد لايجوز (المبسوط، ج13، ص25)

یعنی ہر وہ معاملہ جس میں غالب پہلو غرر (غیر یقینی) ہو اور معاملہ غیر واضح ہو، وہ جائز نہیں۔

خلاصہ:

ورچول کرنسی کے ذریعے سرمایہ کاری اور نفع حاصل کرنا:

۱- شرعی طور پر جائز نہیں، کیونکہ اس میں غرر اور قمار دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔

۲- یہ معاملہ فقہ حنفی کے اصولوں کے خلاف ہے، اور اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

۳- سرمایہ کاری کے لیے وہ ذرائع اختیار کرنا چاہیے جو شرعی اصولوں پر مبنی ہوں اور جس میں مال کا تحفظ اور استحکام یقینی ہو۔

کیا کاغذی کرنسی کا دَین ورچول کرنسی سے ادا کیا جا سکتا ہے؟

سوال:(5)

جیسے ایک کرنسی کا بقایا دوسری کرنسی سے ادا کرنے کی گنجائش ہےتو کیا کاغذی کرنسی کا دَین ورچول کرنسی کے ذریعہ ادا کیا جا سکتا ہے؟

جواب:(5)

کاغذی کرنسی کے قرض کو ورچول کرنسی کے ذریعے ادا کرنے کا حکم فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل اصولوں پر مبنی ہے:

فقہ حنفی میں مختلف کرنسیوں کے تبادلے کا اصول:

فقہ حنفی کے مطابق مختلف کرنسیوں (اجناس) کے تبادلے میں یہ امور ملحوظ رکھنا ضروری ہیں:

۱- قیمت کی تعیین:

تبادلے کے وقت دونوں کرنسیوں کی قیمت کا تعین ضروری ہے تا کہ معاملہ دھوکہ دہی اور غرر سے پاک ہو۔

۲-ادائیگی کی شرط:

اگر ایک کرنسی کو دوسری کرنسی سے تبدیل کیا جائے ،تو معاملہ نقد (ہاتھوں

ہاتھ) ہونا ضروری ہے۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

كل ما كان من جنسين مختلفين فجائز بيع بعضه ببعض نقدًا كان أو نساءً، لعدم علة الربا بينهما (بدائع الصنائع، ج5،ص190)

یعنی اگر دو مختلف اجناس ہوں تو ان کا تبادلہ جائز ہے، خواہ نقد ہو یا اُدھار، کیونکہ ان کے درمیان سود کا سبب نہیں پایا جاتا۔

ورچول کرنسی کے ذریعے قرض کی ادائیگی کا حکم:

ورچول کرنسی کی موجودہ حیثیت غیر مستحکم اور غیر معین ہے، کیونکہ:

۱- عدم استحکام: ورچول کرنسی کی قیمت میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، جو معاملے میں دھوکہ یا نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔

۲- عرف کی کمی: فقہ حنفی میں لین دین کے لیے عرف کا ہونا ضروری ہے، اور ورچول کرنسی ابھی تک عام عرف میں مکمل طور پر قابل قبول نہیں ہے۔

۳- قانونی تحفظ کی کمی: شریعت میں قرض کی ادائیگی کے لیے وہ وسیلہ استعمال ہونا چاہیے جو شریعت اور قانون میں محفوظ اور مستحکم ہو۔

فقہی اصول کی روشنی میں:

اگر ورچول کرنسی کو عرف عام میں قبول کرلیا جائے اور دونوں فریق اس کی قیمت پر راضی ہوں، تو فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق یہ معاملہ درست ہوسکتا ہے، بشرطیکہ:

۱-قرض خواہ اور مقروض کے درمیان باہمی رضامندی ہو۔

۲-ادائیگی کے وقت ور چول کرنسی کی متعین قیمت طے کی جائے تاکہ دھوکہ دہی اور غرر کا اندیشہ نہ رہے۔

حوالہ:

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

إذا تراضيا على عوض يقوم مقام الدين عند الأداء جاز، لأنه قضاء للحق بعوض معتبر (المبسوط، ج12، ص144)

یعنی اگر دونوں فریق اس بات پر راضی ہوں کہ قرض کے بدلے کوئی اور چیز ادا کی جائے جو عوض کے طور پر معتبر ہو، تو یہ ادائیگی درست ہوگی۔

خلاصہ:

۱-اگر قرض خواہ اور مقروض ور چول کرنسی کے ذریعے ادائیگی پر متفق ہوں، تو یہ فقہ حنفی کے مطابق جائز ہے، بشرطیکہ اس وقت ور چول کرنسی کی قیمت متعین ہو۔

۲-لیکن چونکہ ور چول کرنسی کی موجودہ حیثیت غیر مستحکم ہے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے قرض کی ادائیگی نہ کی جائے جب تک کہ یہ عرف اور شریعت میں مکمل طور پر قابل قبول نہ ہو جائے۔

ورچول کرنسی کے ذریعہ مہر کی تعیین کا حکم

سوال:(6)

کیا ورچول کرنسی کے ذریعہ مہر متعین کیا جا سکتا ہے؟

جواب:(6)

نکاح میں مہر کے لیے ایسی چیز کا متعین کرنا ضروری ہے جو شریعت کی نظر میں مال متقوم ہو اور اس میں قیمت اور قبولیت عرفیہ پائی جاتی ہو۔ فقہ حنفی میں مہر کے لیے ایسی چیز کی تعیین جائز ہے جو مال ہو، قابل قبضہ ہو، اور عرف عام میں قابل قبول ہو۔

فقہ حنفی میں مہر کے اصول:

فقہ حنفی کے مطابق:

۱- مہر کے طور پر ایسی چیز رکھی جا سکتی ہے جو مال ہو اور عورت اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔

۲- علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

كل ما يصلح أن يكون ثمناً في البيع يصلح أن يكون صداقاً (بدائع الصنائع، ج2،ص 275)

یعنی ہر وہ چیز جو بیع میں ثمن بن سکتی ہو، وہ مہر کے طور پر بھی جائز ہے۔

۳- اگر مہر کسی ایسی چیز میں متعین کیا جائے جس کی قیمت اور عرف میں حیثیت مستحکم نہ ہو، تو یہ شرعاً درست نہیں ہوگا، کیونکہ مہر کا مقصد عورت کو مالی تحفظ فراہم کرنا ہے۔

ورچول کرنسی کا مہر کے طور پر استعمال:

ورچول کرنسی کے ذریعے مہر متعین کرنے کے بارے میں درج ذیل پہلو قابل غور ہیں:

۱- مال متقوم ہونے کی شرط:

ورچول کرنسی کے مال متقوم ہونے میں اختلاف اور غیر یقینی صورتحال پائی جاتی ہے۔ اگر کسی علاقے یا عرف میں ورچول کرنسی کو مال متقوم تسلیم کرلیا گیا ہو اور اس کی قیمت مستحکم ہو، تو مہر کے طور پر اس کی تعیین ممکن ہے۔

۲- قیمت کا تعین:

فقہ حنفی میں مہر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی قیمت متعین اور معلوم ہو، تاکہ کسی قسم کے دھوکہ یا تنازع کا اندیشہ نہ ہو۔ ورچول کرنسی کی غیر مستحکم قیمت مہر کے لیے اشکال پیدا کرسکتی ہے۔

۳-عرف کی حیثیت:

ورچول کرنسی کا استعمال ابھی تک عام عرف میں مکمل طور پر تسلیم شدہ نہیں

ہے۔ جب تک یہ عرف میں مستحکم حیثیت نہ اختیار کرے، اس کو مہر کے طور پر مقرر کرنا شرعی طور پر محلِ نظر رہے گا۔

فقہی حوالہ:

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

إذا كان المسمّى مجهولاً أو مالا قيمة له، فالصداق لا يثبت بذلك (المبسوط، ج5، ص63)

یعنی اگر مہر میں متعین کی گئی چیز غیر متعین ہو یا اس کی کوئی قیمت نہ ہو، تو ایسا مہر شرعاً درست نہیں ہوگا۔

خلاصہ:

۱- ورچول کرنسی کو مہر کے طور پر تبھی متعین کیا جا سکتا ہے جب:

یہ مال متقوم ہو۔

اس کی قیمت عرف میں مستحکم ہو۔

فریقین اس کی تعیین پر راضی ہوں اور کوئی نزاع کا خطرہ نہ ہو۔

۲- موجودہ حالات میں، جب ورچول کرنسی کی قیمت غیر مستحکم ہے اور عرف عام میں اسے مکمل قبولیت حاصل نہیں، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مہر کے طور پر مقرر نہ کیا جائے۔

سودی قرض سے متعلق بعض مسائل

لون یعنی حکومتی قرض لینے کا حکم

سوال:(1)

حکومت اپنے شہری کو مختلف ضروریات کی تکمیل کے لیے لون یعنی سودی قرض دیتی ہے؛ اوراس کے بعد سود کے ساتھ وہ قرض وصول کرتی ہے؛ سوال یہ ہے کہ یہ لون اور سودی قرض کیا ٹیکس میں شامل نھیں ھے جو حکومت لیتی ہے؛ کیونکہ ٹیکس بھی عام لوگوں کی ملکیت ہوتی ہے اوراس کا مصرف بھی عام ہوتا ہے؛ تو کیا محض اس وجہ سے کہ حکومت اسے سود کہتی ہے اسے ربوا شرعی قرار دے کر حرام کہہ دیا جائے؟ اوراس کی وجہ سے قرض لینے کو بھی حرام سمجھا جائے؟ یا اسے بھی ٹیکس ھی کی ایک شکل سمجھ کر اس کی ادائیگی کو جائز؟ اور ایسے قرض لینے کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب:(1)

آپ کے سوال کے مختلف پہلوؤں کا شرعی اور فقہی لحاظ سے جائزہ لیتے ہیں:

سودی قرض کا حکم:

شریعتِ مطہرہ میں قرض کے ساتھ سود لینے اور دینے کو ربا (سود) قرار دیا گیا ہے اور اس کی حرمت قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (البقرہ:275)

ترجمہ: "اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا"۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لَعَنَ اللّٰهُ آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ" (صحیح مسلم، حدیث نمبر:1598)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی"۔

حکومتی قرض اور ٹیکس میں فرق:

ٹیکس اور سود کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ:

۱۔ٹیکس: حکومت شہریوں سے ان کی اجتماعی ضروریات کے لیے وصول کرتی ہے اور اس کی نوعیت جبری ہوتی ہے۔

۲۔سود: یہ دو افراد یا فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہے، جس میں قرض کے ساتھ اضافی رقم وصول کی جاتی ہے، جو شریعت میں حرام ہے۔

۳-حکومتی قرض: حکومت اگر کسی شہری کو قرض دے اور اس پر سود وصول کرے تو اس کا حکم عام سود ہی کا ہوگا، کیونکہ سود کی حرمت کسی بھی شکل میں بدلتی نہیں ہے۔

حکومتی سودی قرض کو ٹیکس قرار دینا

حکومت سودی قرض کو ''ٹیکس'' کے زمرے میں نہیں لاسکتی، کیونکہ:

۱-شریعت میں سود اپنی حقیقت میں ایک ظلم ہے، جب کہ ٹیکس عوامی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔

۲-حکومت کا اسے سود کہنا اور معاہدے میں سود کی شرط لگانا واضح طور پر ربا کو ثابت کرتا ہے۔

سودی قرض لینا:

فقہ حنفی کی روشنی میں:

سودی قرض لینا صرف اس صورت میں جائز ہے جب مجبوری کی حالت ہو، جیسے جان، مال یا عزت کا خطرہ ہو، اور کوئی متبادل نہ ہو۔

امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَالضَّرُورَاتُ تُبِيحُ الْمَحْظُورَاتِ''۔

ترجمہ: ''ضرورتیں ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں''۔(المبسوط، ج:14،ص:64)

نتیجہ:

۱-حکومتی سودی قرض کو ٹیکس سمجھنا درست نہیں۔

۲-اس قرض کو لینا عام حالت میں جائز نہیں۔

۳-سخت مجبوری کی صورت میں، جب کوئی اور راستہ نہ ہو، تو شریعت نے اضطرار کے تحت گنجائش دی ہے، لیکن پھر بھی سود ادا کرنا معصیت ہوگا اور توبہ ضروری ہوگی۔

کیا سودی قرض کے جواز کی گنجائش ہے؟

سوال:(2)

حاکم کو رعایا کے اموال پر بعض تصرفات کے جو خصوصی حقوق حاصل ہوتے ہیں؛ آیا سودی قرض کو ان میں شامل کر کے کوئی جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

جواب:(2)

شریعتِ مطہرہ نے حاکم کو رعایا کے اموال پر بعض تصرفات کے اختیارات دیے ہیں، لیکن یہ تصرفات ہمیشہ عدل و انصاف اور شریعت کے اصولوں کے تحت محدود رہتے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں شریعت کے اصولوں اور احکام کو پس پشت ڈالنا یا ان کے خلاف کوئی اقدام کرنا جائز نہیں، خواہ وہ اقدام حاکم کی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے۔

سودی قرض (ربا) کا مسئلہ شریعتِ اسلامی میں واضح اور قطعی طور پر حرام ہے، اور اس کی حرمت نصوصِ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سود کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (البقرۃ:275)

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود لینے، دینے، لکھنے اور اس پر گواہ بننے والے تمام افراد پر لعنت فرمائی ہے:

"عن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" (صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، حدیث:1598)

فقہ حنفی کی کتب میں بھی سود کی حرمت پر زور دیا گیا ہے اور اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ الدر المختار میں ہے:

"والربا حرام في كل الشرائع" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب البیوع، باب الربا)

اسی طرح بدائع الصنائع میں سود کی حرمت کو مزید واضح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ سود کی کسی بھی صورت کو جائز قرار دینا شرعاً ناممکن ہے:

"وأما ربا النسيئة فلا خلاف في أنه كان حراماً في الشرائع كلها"

(بدائع الصنائع، کتاب البیوع، فصل فی الربا)

لہٰذا، حاکم کے پاس جو اختیارات ہیں، وہ شریعت کے دائرے کے اندر محدود ہیں۔ سود کے معاملے میں، چونکہ یہ بذاتِ خود حرام اور شریعت کے احکام کے

خلاف ہے، اس لیے کسی بھی صورت میں حاکم یا ریاست کے لیے اسے جائز قرار دینا ممکن نہیں۔

کیا ضرورت و حاجت کی وجہ سے سودی قرض کو جائز کہا جا سکتا ہے؟

سوال:(3)

اگر سود کی رقم شرعی طور پر ربوا میں داخل ہے؛ تو کیا ضرورت یا حاجت کی بنیاد پر اس کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور ضرورت اور حاجت کا معیار کیا ہوگا؟ اس کو کیسے طے کیا جائے گا کہ کون سی چیز ضرورت میں داخل ہے؟ اور کون سی چیز حاجت میں؟ اس کے حدود کی نشاندہی فرمائیں۔

جواب:(3)

سود (ربوا) کا معاملہ اسلامی شریعت میں سختی سے منع کیا گیا ہے اور اسے حرام اور کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سود کو ختم کرنے اور اس سے بچنے کی واضح تاکید فرمائی ہے۔

ضرورت اور حاجت کا مفہوم اور معیار:

فقہ حنفی میں ''ضرورت'' اور ''حاجت'' کے اصولوں کو الگ الگ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

۱-ضرورت:

ضرورت ایسی کیفیت کو کہتے ہیں جس میں کسی حرام چیز کے بغیر جان یا دین کو نقصان لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً زندگی کو بچانے کے لیے حرام کھانے کی اجازت۔

۲-حاجت:

حاجت ایسی کیفیت کو کہتے ہیں جو انسان کی زندگی کو شدید تکلیف یا دشواری سے بچانے کے لیے ضروری ہو، لیکن وہ جان یا دین کے نقصان تک نہ پہنچے۔ حاجت کی مثال کسی کے لیے مکان کا بندوبست کرنا ہے، جو بنیادی ضرورت ہے لیکن زندگی کا مسئلہ نہیں ہے۔

ضرورت اور حاجت کے شرعی اصول:

فقہ حنفی کے مطابق:

"الضرورات تبیح المحظورات"۔

(ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں)۔

لیکن یہ اصول مطلق نہیں، بلکہ اس کے ساتھ حدود اور قیود بھی ہیں۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالہ:

۱-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الضرورات تبيح المحظورات بقدرها، فلا يجوز تعدی الضرورة"۔

(ضرورت صرف اسی حد تک ممنوعات کو جائز کرتی ہے جس قدر ضرورت ہو، ضرورت سے آگے تجاوز جائز نہیں)،(بدائع الصنائع، ج7،ص235)

۲-امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة فی إباحة المحظورات دفعاً للمشقة، إلا أن الحاجة أقل من الضرورة فی المرتبة"۔

(حاجت کو ضرورت کے درجے میں رکھا جاتا ہے تاکہ مشقت کو دفع کیا جاسکے، لیکن حاجت ضرورت سے کم درجے کی ہوتی ہے)،(المبسوط، ج11،ص213)

ربا کے معاملے میں ضرورت یا حاجت:

سود کے استعمال کو کسی حاجت یا ضرورت کی بنیاد پر جائز قرار دینے کے لیے درج ذیل نکات پر غور کیا جائے گا:

۱-کیا صورتِ حال میں زندگی، دین، عقل، نسل، یا مال کو حقیقی خطرہ لاحق ہے؟

۲-کیا اس کے بغیر کوئی اور حلال متبادل موجود نہیں؟

۳-کیا یہ معاملہ وقتی اور استثنائی نوعیت کا ہے؟

سود کا استعمال جائز نہیں:

اگرچہ فقہ میں ضرورت کے تحت بعض حرام چیزوں کو جائز قرار دیا جاتا ہے،

لیکن سود کا معاملہ ان میں شامل نہیں، کیونکہ سود کی ممانعت قرآن وسنت سے قطعی ہے اوراس کی حرمت میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**وأحل الله البيع وحرم الربا**" (البقرہ:275)

حتمی فیصلہ:

سود کا استعمال حتیٰ کہ ضرورت کے تحت بھی جائز نہیں، سوائے اس کے کہ جان بچانے کی نوبت ہو، اوراس کا متبادل کوئی بھی موجود نہ ہو۔

دارالاسلام اور غیر دارالاسلام میں سودی نظام کا حکم

سوال:(4)

ایسے مقامات جہاں اقتدار اعلی مسلمانوں کو حاصل ہے اور بلا سودی قرض کا نظام جاری کرنا ان کے اختیار میں ہے؛ اور ایسے مقامات جہاں قوانین کو مکمل شریعت کے مطابق نہیں بنایا جا سکتا؛ اور مسلمان اپنے اختیار سے غیر سودی نظام نافذ نہیں کرسکتا؛ ان دونوں حالات کے درمیان کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو کیا ہوگا؟

جواب:(4)

ایسے مقامات جہاں اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو اور وہ بلا سودی نظام کو نافذ کرنے کے اختیار میں ہوں، وہاں اسلامی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا مسلمانوں

کی شرعی ذمہ داری ہے۔ان مقامات پر سود کا خاتمہ، بلاسودی قرض کے نظام کا قیام، اور معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق ترتیب دینا لازم ہوگا، کیونکہ مسلمانوں کو شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔قرآن کریم میں واضح حکم ہے:

"وَأَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (البقرۃ:275)

"اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے"۔

نیز، فقہ حنفی کی رو سے سدّ الذرائع (برائی کے اسباب کا خاتمہ) کے اصول کے تحت، جب اختیار ہو، تو سود جیسے کبیرہ گناہ کو جڑ سے ختم کرنا واجب ہے۔

دوسری حالت:

جہاں مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہ ہو اور وہ سود کے خاتمے یا بلاسودی نظام کے نفاذ کے قابل نہ ہوں، وہاں ان کی ذمہ داری بدل جاتی ہے۔ایسی حالت میں ان پر لازم ہوگا کہ وہ خود سودی معاملات سے بچیں، اپنے دائرہ اختیار میں شریعت پر عمل کریں، اور اسلامی معیشت کے قیام کے لیے جدوجہد جاری رکھیں۔لیکن چونکہ مکمل اسلامی قوانین نافذ کرنا ان کے اختیار سے باہر ہے، اس لیے ان پر شرعاً مواخذہ نہیں ہوگا۔

فقہ حنفی میں اصول ہے:

"لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعھا" (البقرۃ:286)

''اللہ کسی نفس کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا''۔

فقہاء کرام کے مطابق جہاں اختیار موجود ہو، وہاں عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اور جہاں اختیار نہ ہو، وہاں بقدر استطاعت کوشش کرنا کافی ہے۔

فقہ حنفی کے حوالہ جات:

۱-''اذا تولی المسلمون إمارة فیجب علیھم الحکم بما أنزل اللہ''

(الدرالمختار، کتاب الحظر والإباحۃ)۔

''جب مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو، تو ان پر لازم ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلے کریں''۔

۲-''کل مکلفٍ مکلفٌ بقدر استطاعته'' (ردالمحتار، کتاب القضاء)

''ہر مکلف پر بقدر استطاعت ذمہ داری عائد کی جاتی ہے''۔

خلاصہ:

ان دونوں حالات میں فرق واضح ہے:

۱-جہاں اقتدار اعلیٰ ہو، وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ واجب ہے۔

۲- جہاں اختیار نہ ہو، وہاں مسلمانوں پر سودی نظام سے بچنے اور اپنے دائرہ اختیار میں اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہے۔

تشبہ سے متعلق مسائل

تشبہ کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:(1)

تشبہ کی حقیقت کیا ہے؟

جواب:(2)

تشبہ کا مطلب کسی اور قوم، مذہب، یا گروہ کی ایسی مخصوص اور نمایاں صفات، عادات، یا طور طریقوں کو اپنانا ہے جو ان کے لیے خاص ہوں اور ان کی پہچان بنیں۔ اسلام میں تشبہ کی ممانعت کا حکم اس وقت آتا ہے جب کوئی مسلمان غیر اسلامی یا غیر شرعی عادات و اطوار کو اپنائے، خاص طور پر وہ چیزیں جو کفر یا فسق کی علامت ہوں۔

قرآنِ کریم میں تشبہ کی مذمت:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (سورہ ہود:113)

ترجمہ: ''اور ظالموں کی طرف نہ جھکو، ورنہ تمہیں آگ چھو لے گی''۔

یہ آیت ظالموں اور کافروں کے طور طریقوں اور ان کے رجحانات کی پیروی سے بچنے کی واضح نصیحت ہے۔

حدیثِ مبارکہ میں تشبہ کی ممانعت:

۱-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''**مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ**'' (سنن ابوداؤد، حدیث: 4031)

ترجمہ: ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے شمار ہوگا''۔

یہ حدیث مسلمانوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ کفار اور فاسق لوگوں کی مشابہت سے بچیں، کیونکہ اس کا نتیجہ ایمان اور اسلامی تشخص کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔

۲-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''**خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ**'' (صحیح بخاری، حدیث: 5892)

ترجمہ: ''مشرکوں کی مخالفت کرو''۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں تشبہ کا ذکر:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' میں تشبہ سے متعلق ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے:

''**وَيُكْرَهُ التَّشَبُّهُ بِالْكُفَّارِ فِيمَا هُوَ شِعَارُهُم**'' (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، صفحہ: 327)

ترجمہ: ''کفار کی ان چیزوں میں مشابہت مکروہ ہے جو ان کے شعار اور مخصوص علامت ہوں''۔

تشبہ کی اقسام:

۱-کفر میں مشابہت:

کفر کے شعائر اور علامات کو اپنانا، جیسے بت پرستی، صلیب پہننا، یا کفریہ تہوار منانا۔ یہ حرام اور موجبِ گناہِ کبیرہ ہے۔

۲-فسق میں مشابہت:

فاسق و فاجر لوگوں کے لباس، طرزِ زندگی، اور عادات کو اپنانا، جیسے غیر اسلامی طرزِ لباس یا بے حیائی پر مبنی رسمیں۔

۳-عادی امور میں مشابہت:

جو چیزیں کسی خاص قوم سے خاص نہ ہوں بلکہ عمومی ہوں، ان میں مشابہت ممنوع نہیں، جب تک کہ وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔

خلاصہ:

تشبہ ایک اہم اسلامی مسئلہ ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے ایمان اور اسلامی تشخص کی حفاظت کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کی کتب

میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان کفار، مشرکین اور فاسق لوگوں کے مخصوص عادات واطوار سے اجتناب کریں تا کہ ان کی دینی شناخت برقرار رہے۔

تشبہ سے کونسا تشبہ مراد ہے؟

سوال:(2)

بہت سی چیزوں میں فطری طور پر مماثلت پائی جاتی ہے؛ اور ایک ہی معاشرے میں رہنے والے لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں؛ تو کیا ہر تشبہ کی ممانعت ہے؟ یا خاص نوعیت کا تشبہ مراد ہے؟

جواب:(2)

تشبہ (کسی کی مشابہت اختیار کرنا) کے حوالے سے فقہ حنفی اور اسلامی تعلیمات کا اصول یہ ہے کہ ہر قسم کی مشابہت ممنوع نہیں ہے، بلکہ ممانعت صرف اسی مشابہت کی ہوتی ہے جو شریعت کے خلاف ہو یا جس میں غیر مسلموں کی مخصوص مذہبی یا ثقافتی علامات کو اپنانا شامل ہو۔

تشبہ کی اقسام:

ا - تشبہ فی العادات

وہ چیزیں جو انسانی فطرت میں داخل ہوں اور کسی خاص مذہب یا ملت کے

ساتھ مخصوص نہ ہوں، جیسے لباس، کھانے پینے کے انداز، یا زندگی گزارنے کے عام طریقے۔اس قسم کی مشابہت ممنوع نہیں ہے۔

۲-تشبہ فی الشعائر:

ایسی مشابہت جس میں غیر مسلموں کی مذہبی یا قومی علامات کو اپنانا شامل ہو، جیسے ان کے مذہبی تہواروں کی نقل کرنا یا ان کے خاص مذہبی لباس پہننا۔ یہ تشبہ حرام ہے، کیونکہ اس میں ان کے عقائد اور ثقافت کو اپنانے کا پہلو نکلتا ہے۔

فقہ حنفی کے حوالہ سے اصولی وضاحت:

فقہاء نے "تشبہ" کے حوالے سے ایک عمومی قاعدہ بیان کیا ہے:

"من تشبه بقوم فهو منهم"۔

(جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ ان ہی میں سے سمجھا جائے گا)،

(سنن ابی داود، حدیث:4031)

معتبر کتب فقہ کے حوالے:

ا-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والتشبه بالكفار إن كان في أمور دينهم فهو كفر، وإلا فإن كان في شعائرهم المختصة بهم فهو حرام" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1، صفحہ 313)

یعنی کافروں کی مشابہت اگر ان کے دینی امور میں ہو تو کفر ہے، اور اگر ان کے خاص شعائر میں ہو تو حرام ہے۔

۲-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**وما لم يكن من شعارهم فلا بأس به**" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 130)

یعنی جو چیز کافروں کی شعائر سے نہیں ہے، اس میں مشابہت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ:

ہر تشبہ ممنوع نہیں ہے۔ ممانعت خاص طور پر غیر مسلموں کی دینی اور ثقافتی علامات کی مشابہت اختیار کرنے میں ہے، جبکہ وہ چیزیں جو عام فطرت اور انسانی عادات کا حصہ ہوں، ان میں مشابہت ممنوع نہیں۔

تشبہ کے اصول

سوال: (3)

کن امور میں تشبہ مباح ہے؟ کن امور میں تشبہ کفر ہے؟ کن امور میں تشبہ مکروہ ہے؟ اس سلسلے میں تشبہ کے جو اصول ہیں ان پر روشنی ڈالیے۔

جواب: (3)

تشبہ کے مسائل قرآن کریم، احادیث مبارکہ، اسلامی تعلیمات اور فقہ حنفی کی روشنی میں واضح ہیں۔ تشبہ کا مطلب ہے کسی اور قوم یا گروہ کے طرزِ عمل، لباس، عادات

یا عبادات میں مشابہت اختیار کرنا۔ تشبہ کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- وہ امور جن میں تشبہ کفر ہے:

کسی غیر مسلم قوم کی عبادات یا ان کے شعائرِ کفر کو اپنانا۔

دین اسلام کے عقائد کے خلاف کسی کافر قوم کی مذہبی رسومات کو اختیار کرنا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"**وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ**" (سورۃ المائدہ: 51)

یعنی جو شخص ان (کافروں) سے دوستی رکھے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔

حدیث مبارکہ میں ہے:

"**من تشبہ بقوم فھو منھم**" (سنن ابوداؤد: 4031)

یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔

۲- وہ امور جن میں تشبہ مکروہ ہے:

غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت ایسے امور میں جو دینی یا اعتقادی نہ ہوں لیکن ان کی خاص پہچان ہوں، مثلاً لباس یا طرزِ عمل۔

فقہ حنفی میں ہے:

"**وَيُكْرَهُ التَّشَبُّهُ بِالْكُفَّارِ فِي مَا هُوَ شِعَارٌ لَهُمْ**" (فتاویٰ ہندیہ، جلد 5، صفحہ 327)

یعنی کفار کے ساتھ ان کے شعائر میں مشابہت مکروہ ہے۔

۳-وہ امور جن میں تشبہ مباح ہے:

ایسے امور جن کا تعلق دین یا اعتقاد سے نہ ہو اور وہ انسانی ضروریات میں شامل ہوں، جیسے ٹیکنالوجی، علاج، یا دیگر دنیوی معاملات۔

قرآن کریم میں ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ" (سورۃ الاعراف:32)

یعنی کہہ دیجیے: کس نے اللہ کی زینت کو حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے؟

فقہ حنفی میں بھی دنیوی ضروریات میں مشابہت کی گنجائش دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ دین وعقائد پر اثر انداز نہ ہو۔

تشبہ کے اصول:

۱-اگر مشابہت کفریہ اعمال یا شعائرِ کفر میں ہو، تو یہ کفر ہے۔

۲-اگر مشابہت غیر مسلموں کے ساتھ ایسے امور میں ہو جو ان کی خاص پہچان ہوں، تو یہ مکروہ ہے۔

۳-اگر مشابہت عام دنیوی امور میں ہو، تو یہ مباح ہے، بشرطیکہ اس میں دین یا اخلاق کو نقصان نہ پہنچے۔

نتیجہ:

تشبہ کے جائز یا ناجائز ہونے کا مدار نیت، عمل کی نوعیت، اور شریعت کے احکام پر ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ شعائرِ اسلام کی پاسداری کرے اور کفار کے شعائر اور ان کے طرزِ عمل سے اجتناب کرے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم کس درجہ کی روایت ہے؟

سوال: (4)

"**من تشبه بقوم فهو منهم**"۔

کس درجہ کی روایت ہے؟

جواب: (4)

حدیث "**من تشبه بقوم فهو منهم**" (ترجمہ: جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے) ایک مشہور حدیث ہے جو مختلف کتبِ حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ یہ حدیث اپنے مفہوم اور حکم کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور اس کے صحیح ہونے پر محدثین نے اتفاق کیا ہے۔

۱- حدیث کا ماخذ اور صحت:

یہ حدیث سنن ابی داود (کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ) میں حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ امام ابو داود نے اسے نقل کیا اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

۲-ائمہ حدیث کی آراء:

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ حدیث سنداً صحیح ہے اور اس کا مفہوم واضح اور شرعی اصولوں کے مطابق ہے" (اقتضاء الصراط المستقیم:1/240)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو معتبر قرار دیا ہے اور فرمایا کہ یہ مسلمانوں کو کفار کی مشابہت سے روکنے کے لیے بنیادی اصول ہے۔(فتح الباری:10/271)

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مفہوم کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ معاشرتی اور اخلاقی رہنمائی کا اہم حصہ ہے۔(نیل الاوطار:8/104)

۳- حدیث کا پس منظر اور مفہوم:

یہ حدیث اس بات پر زور دیتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی انفرادی شناخت کو برقرار رکھنا چاہیے اور کفار یا غیر اسلامی تہذیبوں کی تقلید سے گریز کرنا چاہیے، چاہے وہ لباس، رسم و رواج، یا اخلاقی اقدار ہوں۔

۴-تاریخی تناظر:

تاریخ میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ جب مسلمانوں نے غیر اسلامی اقوام کی

مشابہت اختیار کی تو ان کے عقائد اور اخلاق میں کمزوری پیدا ہوئی۔ اس لیے یہ حدیث امتِ مسلمہ کی انفرادیت اور دین کے تحفظ کے لیے ایک مضبوط اصول فراہم کرتی ہے۔

خلاصہ:

یہ حدیث ''حسن'' کے درجے کی ہے اور محدثین کے ہاں معتبر ہے۔ اس کی تعلیمات کو آج کے دور میں بھی مسلمانوں کے لیے رہنما اصول کے طور پر اپنانا ضروری ہے۔

کوئی وضع کبھی قوم کی پہچان ہو بعد میں ختم ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:(5)

کوئی بھی فعل یا وضع جو ایک زمانے میں کسی خاص قوم کی پہچان رہی ہو اگر وہ عام ہو جائے اور مختلف قوم کے لوگ اس کو استعمال کرنے لگیں تو کیا اب بھی اس میں تشبہ باقی رہے گا؟ یا تشبہ کی جہت ختم ہو جائے گی؟

جواب:(5)

کسی بھی فعل یا وضع کے بارے میں جو کسی خاص قوم کی پہچان رہی ہو، اس کے استعمال میں تشبہ کا حکم اس بات پر موقوف ہے کہ آیا وہ عمل یا وضع اب بھی اس قوم کی شناخت یا شعار کے طور پر باقی ہے یا نہیں۔ اگر وہ وضع یا فعل اب اس قوم کے ساتھ خاص نہ رہے اور مختلف قوموں میں عام ہو جائے تو اس میں تشبہ کی علت ختم ہو جاتی ہے،

اور اس کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی اور شرعی ممانعت نہ ہو۔

قرآن مجید کی رہنمائی:

اللہ تعالیٰ نے کفار اور فاسقین کی مشابہت سے اجتناب کا حکم دیا ہے:

"وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ" (الاعراف:142)

یعنی فاسقوں اور مفسدین کے راستے پر نہ چلو۔

حدیث شریف کی روشنی:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داؤد:4031)

"جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں شمار ہوگا"۔

یہاں تشبہ کا حکم ان افعال پر ہے جو کسی خاص قوم کے شعار کے طور پر معروف ہوں۔

فقہ حنفی کی وضاحت:

فقہ حنفی کی کتب میں بھی تشبہ کے حکم کی بنیاد "قوم کے ساتھ اختصاص" پر رکھی گئی ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَإِنَّ مَا لَا يَكُونُ شِعَارًا لَهُمْ لَا يُعَدُّ تَشَبُّهًا بِهِمْ" (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحظر والاباحۃ)

یعنی جو چیز کفار کا شعار نہ ہو، اس کا استعمال تشبہ میں شمار نہیں ہوگا۔

نتیجہ:

اگر کوئی چیز یا وضع کسی زمانے میں کسی خاص قوم کی پہچان رہی ہو، لیکن بعد میں وہ عام ہو جائے اور مختلف قوموں میں رائج ہو جائے تو اب اس میں تشبہ کی علت باقی نہیں رہے گی۔ تاہم، اگر وہ وضع کسی حرام یا مکروہ امر سے متعلق ہو تو اس سے اجتناب بہر حال ضروری ہے۔

(ب) مذہبی امور میں تشبہ:

ہندوؤں، عیسائیوں کے مذہبی امور میں شرکت کا حکم

سوال: (1)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبہ کی بعض ایسی قسموں سے منع فرمایا جن میں مذہبی امور میں تشبہ پایا جاتا ہے؛ جیسے اپ نے یہودیوں کے تشبہ سے بچنے کے لیے افطار میں عجلت کا حکم دیا؛ تو اب سوال یہ ہے کہ مذہبی امور میں تشبہ سے کیا مراد ہے؟ ہمارے ملک میں بہت سے دین سے ناواقف نوجوان برادران وطن کے ساتھ ہولی کھیلتے ہیں؛ دیوالی میں پٹاخے پھوڑتے ہیں؛ کرسمس میں شریک ہو جاتے ہیں؛ ہندو بھائیوں کے تیوہاروں میں بھی شریک ہوتے ہیں؛ جیسے وہ اپنے گھروں پر

زعفرانی جھنڈے لگاتے ہیں؛ مسلمان بھی رنگ کی تبدیلی کے ساتھ جھنڈے لگاتے ہیں؛ یوگا کرتے ہیں؛ ملاقات کے لیے نمستے کہتے ہیں؛ تو کیا ان افعال کا شمار مذہب کے اعتبار سے تشبہ میں ہوگا؟

جواب:(1)

تشبہ (مشابہت اختیار کرنا) ایک ایسا موضوع ہے جو اسلامی شریعت میں انتہائی حساسیت کا حامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر غیر مسلموں کے مذہبی شعائر اور خصوصیات میں مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، خصوصاً وہ امور جن کا تعلق ان کے مذہبی اعتقادات یا عبادات سے ہو۔ قرآنِ پاک، حدیث شریف، اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اس سوال کا جواب درج ذیل ہے:

قرآن کریم کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ“ (سورۃ ہود: 113)

ترجمہ: اور ظالموں کی طرف مائل نہ ہو، ورنہ تمہیں آگ چھو جائے گی“۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ظالموں (کفار و مشرکین) کی طرف جھکاؤ بھی خطرناک ہے، جو ان کے مذہبی معاملات میں شمولیت یا مشابہت سے کہیں زیادہ سنگین ہوگا۔

حدیث شریف کی روشنی میں:

۱- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داود:4031)

ترجمہ: "جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں سے ہوگا"۔

۲- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:

"لَا يَزَالُ الدِّينُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ؛ لِأَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى يُؤَخِّرُونَ" (سنن ابی داود:2353)

ترجمہ: دین غالب رہے گا جب تک لوگ افطار میں جلدی کریں گے، کیونکہ یہود ونصاریٰ افطار کو مؤخر کرتے ہیں"۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ کفار کے مذہبی امور میں تشبہ اختیار کرنا یا ان کی رسم ورواج میں شمولیت اختیار کرنا ممنوع ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہائے کرام نے بھی تشبہ کو حرام قرار دیا ہے، خصوصاً وہ امور جو کفار کے مذہبی تہواروں اور رسومات کے ساتھ خاص ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التشبّه بالكفار فيما هو من خصائصهم حرامٌ قطعاً، كالاحتفال

بأعيادهم أو إظهار شعائرهم" (ردالمحتار: 1/411)

ترجمہ: ''کفار کی ان چیزوں میں مشابہت جو ان کے مذہبی شعائر میں سے ہوں، قطعاً حرام ہے، جیسے ان کے تہوار منانا یا ان کی شعائر کا اظہار کرنا''۔

آپ کے سوال کے مختلف پہلوؤں کا جواب:

۱- ہولی کھیلنا، دیوالی پر پٹاخے پھوڑنا، اور کرسمس میں شمولیت:

یہ تمام افعال کفار کے مذہبی تہواروں سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں شمولیت یا ان کے ساتھ حصہ لینا تشبہ فی الدین کے زمرے میں آتا ہے، جو سخت ممنوع ہے۔

۲- زعفرانی جھنڈے لگانا:

یہ بھی کفار کے مذہبی شعائر سے مشابہت ہے، خواہ رنگ تبدیل کر دیا جائے، یہ فعل ممنوع ہوگا۔

۳- یوگا اور نمستے کہنا:

یوگا: اگر یوگا کا تعلق کسی مذہبی رسم یا عقیدے سے ہے (جیسا کہ سورج کو نمسکار)، تو یہ حرام ہے۔ لیکن اگر یہ صرف ایک ورزش کے طور پر ہو، تو علماء کرام کے درمیان اس پر اختلاف ہے۔

نمستے کہنا: یہ ہندو مذہب کی ایک مخصوص مذہبی عبارت ہے، جس کا مطلب

سجدہ یا تعظیم ہے، لہٰذا اس کا استعمال ممنوع ہے۔

نتیجہ:

کفار کے مذہبی امور اور تہواروں میں شمولیت یا ان کی تقلید اسلامی اصولوں کے خلاف ہے اور سخت گناہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے اعمال اور رسوم کو اسلامی تعلیمات کے مطابق رکھیں اور کفار کے طرزِ زندگی یا شعائر کی نقل سے مکمل اجتناب کریں۔

شعائر دین سے کیا مراد ہے؟

سوال: (2)

ایک اہم سوال یہ ہے کہ شعائر دین سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ شعار کی خصوصی اہمیت ہے؛ اور جو باتیں دوسری قوموں کے مذہبی شعار میں شامل ہوں ان کو اختیار کرنا تشبہ کی سنگین ترین صورت ہے؛ جیسے اج کل بہت سے تعلیمی اداروں میں وندے ماترم پڑھوایا جاتا ہے؛ بائبل یا گیتا سے دعائیہ کلمات پڑھوائے جاتے ہیں؛ سرسوتی نامی دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جاتا ہے؛ پیشانی پر مسلمان لیڈرز بھی قشقشہ لگواتے ہیں؛ ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام کے نعرے لگوائے جاتے ہیں؛ مشنری اسکولوں میں ان کے عقائد کے مطابق حضرت مسیح کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا جاتا ہے؛ یا کسی قدر جھکا جاتا ہے کیا یہ سب شعائر کفر میں داخل ہیں؟

جواب:(2)

شعائر دین کی تعریف:

شعائر دین سے مراد وہ مخصوص عبادات، علامات اور احکام ہیں جو اسلام کے امتیازی نشانات اور اس کی پہچان ہیں، جیسے نماز، اذان، روزہ، حج، قربانی، اور دیگر اعمال جن سے دینِ اسلام کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی تعظیم واجب اور ان کی بے حرمتی حرام ہے۔

قرآن مجید:

"وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ" (سورۃ الحج:32)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

غیر اسلامی شعائر میں شمولیت کی ممانعت:

غیر مسلموں کے مذہبی شعائر میں شمولیت یا ان کی نقل وتقلید شریعت کی نظر میں ناجائز، حرام اور بعض صورتوں میں کفر ہے، کیونکہ یہ تشبہ (مشابہت) کی ایک قسم ہے۔

قرآن مجید:

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى لَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ لنَّارُ" (سورۃ ھود:113)

ترجمہ: اور ظالموں کی طرف جھکاؤ مت کرو، ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی۔

حدیث شریف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داود: 4031)

ترجمہ: جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔

آپ کے ذکر کردہ اعمال کا حکم:

۱- وندے ماترم:

یہ ہندو مذہب کے ایک دیوی کی عبادت اور تعریف پر مشتمل ترانہ ہے۔ اسے پڑھنا شرک کے زمرے میں آتا ہے، اور ایک مسلمان کے لیے اس کا پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔

۲- بائبل یا گیتا کے دعائیہ کلمات:

غیر اسلامی مذہبی کتابوں سے دعائیہ کلمات پڑھنا ان کی تقدیس کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے، جو شریعت میں سخت ممنوع ہے۔

۳- سرسوتی دیوی کے سامنے جھکنا:

یہ عمل واضح طور پر شرک ہے، کیونکہ جھکنا عبادت کی ایک قسم ہے اور یہ اللہ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔

حدیث شریف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تَنْحَنُوا" (سنن الترمذی:2728)

ترجمہ: کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں ہے۔

۴-قشقہ لگوانا یا مشرکانہ نعرے لگانا:

یہ عمل غیر اسلامی شعائر کی تقلید اور مشرکانہ عقائد کی ترویج ہے، جو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ہے۔

۵-حضرت مسیح کے سامنے کھڑا ہونا یا جھکنا:

مسیحی عقائد کے مطابق ان کے سامنے جھکنا یا کھڑا ہونا بھی ان کے مذہبی شعائر کی پیروی ہے، جو شریعت میں جائز نہیں۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی میں غیر اسلامی شعائر کی تقلید یا ان میں شمولیت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

الدر المختار:

"التشبه بأهل الكفر في لباسهم و شعائرهم حرام" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 5، صفحہ 268)

ترجمہ: کفار کے لباس اور شعائر میں ان کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔

ردالمحتار:

"لِأَنَّ فِيهِ تَعْظِيمًا لِشِعَارِهِمُ الْبَاطِلَةِ" (جلد 6، صفحہ 363)

ترجمہ: کیونکہ اس میں ان کے باطل شعائر کی تعظیم شامل ہے۔

نتیجہ:

آپ کے ذکر کردہ تمام اعمال (وندے ماترم، غیر اسلامی کتابوں سے دعائیہ کلمات، جھکنا، مشرکانہ علامات جیسے قشقشہ لگوانا اور مشرکانہ نعروں میں شرکت) شعائرِ کفر میں شامل ہیں اور شریعت کی نظر میں ناجائز، حرام اور بعض اوقات کفر کے مترادف ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان سے مکمل اجتناب کریں اور ایسے اداروں میں اپنی شرکت کو محدود کریں جو ان اعمال پر مجبور کرتے ہیں۔

(ج) تہذیبی و قومی امور میں تشبہ:

تہذیب کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے؟

سوال: (1)

تہذیب کا اطلاق کن چیزوں پر ہوگا جو مذھب کا حصہ نہیں سمجھی جائینگی؟

جواب: (1)

تشبہ (کسی قوم یا تہذیب کی مشابہت اختیار کرنا) سے متعلق مسائل اسلامی

شریعت میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں تھذیب کا اطلاق ان امور پر ہوگا جو کسی قوم یا مذہب کی خاص علامات یا ان کی دینی پہچان کا حصہ ہوں۔اگر کوئی چیز مذہبی شعائر یا غیر اسلامی عقائد سے وابستہ ہو،تو اس میں تشبہ ناجائز ہوگا۔

قرآن پاک کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ" (المائدہ:51)

ترجمہ:اور جو ان (کافروں) کو دوست بنائے گا وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو کفار کے مخصوص اعمال،عادات،یا شعائر کی مشابہت سے بچنا چاہیے تاکہ ان کی شناخت برقرار رہے۔

حدیث شریف کی روشنی میں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَن تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابوداؤد،حدیث:4031)

ترجمہ:جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا،وہ انہی میں سے ہوگا۔

یہ حدیث مسلمانوں کو کفار یا دیگر غیر اسلامی اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرتی ہے،خاص طور پر ان امور میں جو ان کی دینی یا قومی پہچان ہیں۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہائے کرام نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التشبّه بالكفار إن كان فيما هو من شعائر دينهم أو مما يختصون به، فهو حرام، وإلا فإن كان مما يفعلونه في عيدهم أو شعارهم يكره تحريماً، وإن كان مما لا يختصون به فلا بأس به" (ردالمحتار، ج1،ص312)

ترجمہ: کفار کی مشابہت اگر ان کے مذہبی شعائر یا ان کے خاص علامات میں ہو، تو یہ حرام ہے۔اور اگر یہ ان کے تہواروں یا شعائر میں ہوتو مکروہِ تحریمی ہے۔اور اگر کسی ایسی چیز میں ہو جو ان کے ساتھ خاص نہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تہذیب کا اطلاق:

تہذیب کا اطلاق ان تمام امور پر ہوگا جنہیں کوئی قوم اپنی مذہبی یا قومی پہچان کے طور پر اختیار کرے، مثلاً:

۱-مخصوص لباس جو دینی علامت ہو (جیسے صلیب کا پہننا)۔

۲-تہواروں میں شرکت یا ان کی مشابہت (جیسے کرسمس یا دیوالی میں حصہ لینا)۔

۳- ایسی عادات جو ان کی مذہبی شناخت کا حصہ ہوں (جیسے عبادت کے مخصوص طریقے)۔

لیکن وہ امور جو مذہب کا حصہ نہ ہوں بلکہ عام انسانی ضروریات، عادات، یا ثقافتی انداز ہوں (جیسے ٹیکنالوجی کا استعمال، خوراک کے طریقے)، تو ان میں تشبہ کا اطلاق نہیں ہوگا جب تک کہ ان میں کوئی غیر شرعی پہلو شامل نہ ہو۔

خلاصہ:

تہذیب کا اطلاق ان امور پر ہوگا جو کسی قوم یا مذہب کی خاص علامات ہوں اور ان سے غیر اسلامی عقائد یا شعائر کی تائید ہوتی ہو۔ تاہم، غیر مذہبی اور عام انسانی امور کو تشبہ میں شمار نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ ان میں شریعت کی مخالفت نہ ہو۔

ساڑی، دھوتی، ٹائی وغیرہ پہننے کا حکم

سوال:(2)

ساڑی؛ دھوتی، ٹائی ہاتھ میں دوڑی؛ خواتین کے لئے سیندور؛ نکلش؛ بندی؛ آنکھوں میں مختلف کلر کے لینس لگانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(2)

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان مردوں اور عورتوں کو لباس اور زینت کے ایسے طریقے اپنانے کا حکم دیا گیا ہے جو شرعی اصولوں کے مطابق ہوں، جن میں حیا، وقار اور دینی تشخص کا لحاظ رکھا جائے۔

ساڑی اور دھوتی:

ساڑی اور دھوتی بنیادی طور پر مختلف ثقافتوں کے مروجہ لباس ہیں۔ اگر ان لباسوں میں شرعی پردے کی تمام شرائط پوری کی جائیں (یعنی جسم کے وہ حصے جن کا چھپانا واجب ہے، مکمل طور پر ڈھکے ہوں، لباس باریک نہ ہو، جسم کی ساخت نمایاں نہ ہو، اور فتنہ سے پاک ہو) تو ان کا پہننا جائز ہے۔ بصورت دیگر ان کا استعمال ناجائز ہوگا۔ قرآن کریم میں حکم ہے:

"يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا" (سورۃ الأعراف:26)

یعنی اللہ تعالیٰ نے لباس کا مقصد ستر پوشی اور زینت قرار دیا ہے، نہ کہ فتنہ یا بے حیائی۔

ٹائی:

ٹائی پہننے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر اس کا استعمال کسی خاص مذہبی یا غیر اسلامی تشخص کو ظاہر کرے، تو یہ ممنوع ہے۔ تاہم اگر ایسا نہ ہو اور محض ایک ثقافتی یا پیشہ ورانہ ضرورت ہو، تو اس کے جواز کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس میں کسی غیر اسلامی نظریے کی تائید نہ ہو۔

ہاتھ میں دوڑی:

ہاتھ میں دھاگا باندھنا اگر کسی غیر اسلامی عقیدے یا رسم سے مشابہت کی

نیت سے ہو، تو یہ ناجائز اور گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَن تشبّہ بِقوم فَھوَ مِنھم" (سنن أبو داود: 4031)

یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں شمار ہوگا۔

خواتین کے لیے سیندور، نکلش، اور بندی:

یہ تمام اشیاء ہندو ثقافت کی علامت سمجھی جاتی ہیں اور ہندو مذہبی رسومات میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مسلمان عورتوں کے لیے ان کا استعمال ناجائز ہے، کیونکہ یہ تشبہ بالکفار میں داخل ہوتا ہے، جو کہ شریعت میں ممنوع ہے۔

آنکھوں میں مختلف کلر کے لینس لگانا:

رنگین کانٹیکٹ لینس کا استعمال اگر محض زینت کے لیے ہو اور اس میں کوئی دھوکہ دہی یا غیر شرعی غرض شامل نہ ہو، تو اس کے استعمال کی اجازت ہوگی۔ لیکن اگر یہ فتنہ کا سبب بنے یا غیر شرعی مقاصد کے لیے استعمال ہو، تو یہ ممنوع ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں ایسے مسائل کے لیے عمومی اصول موجود ہیں:

۱ - "وَلَا تَتَشَبَّھُوا بِالْكُفَّارِ فِي شَيْءٍ مِنْ شَعَائِرِھِمْ" (الدر المختار، جلد 5، صفحہ 272)

۲ - "كُلُّ شَيْءٍ يُؤَدِّي إِلَى الْفِتْنَةِ وَفَسَادِ الْمُجْتَمَعِ فَھُوَ مُحَرَّمٌ"۔

خلاصہ:

یہ ہے کہ ہر وہ عمل، لباس یا زینت جو اسلامی تعلیمات اور حیا و وقار کے

خلاف ہو یا غیر اسلامی ثقافت کی نقالی پر مبنی ہو، وہ نا جائز ہے۔ مسلمان مرد وخواتین کو اپنے طرزِ زندگی میں دینی اصولوں کو مقدم رکھنا چاہیے۔

جولباس غیر مسلموں میں کثرت سے پہنا جاتا ہے اگر مسلمانوں میں بھی رائج ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:(3)

جولباس غیر مسلم حضرات کے یہاں کثرت سے پہنا جاتا ہے جیسے دھوتی؛ شرٹ؛ پینٹ؛ کوٹ؛ ٹائی؛ اگر مسلمان میں بھی اس کا رواج ہوجائے تو کیا اس میں تشبہ باقی رہے گا یا ختم ہوجائے گا۔

جواب:(3)

تشبہ بالکفار (کفار کی مشابہت اختیار کرنا) ایک ایسا عمل ہے جس سے شریعت نے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں انسان کے قلب و ذہن پر غیر اسلامی تہذیب کا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں متعدد مقامات پر اس کے متعلق تنبیہ آئی ہے۔

قرآن کریم کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (سورۃ ہود:113)

ترجمہ: اور تم ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنہوں نے ظلم کیا، ورنہ تمہیں بھی آگ چھو لے گی۔

حدیث مبارکہ کی روشنی میں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"**من تشبه بقوم فهو منهم**" (سنن ابوداود:4031)

ترجمہ: جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے، وہ انہی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہاء کرام نے واضح کیا ہے کہ اگر کسی خاص لباس کا تعلق کسی قوم کے مذہبی شعائر یا ان کی خصوصی تہذیب سے ہو، تو مسلمانوں کے لیے اسے اختیار کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ اس میں ان کی مخصوص شناخت ختم ہونے کا خدشہ ہے۔ لیکن اگر وہ لباس عمومی طور پر تمام قوموں میں رائج ہو جائے اور اس کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا تہذیب سے نہ رہے، تو تشبہ کا حکم باقی نہیں رہتا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"**ان كان اللباس مما يختص بالكفار، فيحرم على المسلم لبسه، وإن صار مشتركاً بينهم وبين المسلمين، فلا بأس به**" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص 333)

وضاحت:

شرٹ، پینٹ، کوٹ، یا دھوتی وغیرہ جیسے لباس اگر کسی وقت غیر مسلموں کی علامت تھے، لیکن آج کے دور میں یہ عمومی طور پر تمام اقوام میں استعمال ہو رہے ہیں، تو ان میں تشبہ کا حکم ختم ہو جائے گا، بشرطیکہ ان کا استعمال کسی غیر اسلامی تہذیب یا عقیدے کی ترجمانی نہ کرے۔

تاہم، مسلمانوں کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنی اسلامی تہذیب اور روایات کے مطابق لباس اختیار کریں، تاکہ ان کی جداگانہ شناخت برقرار رہے۔

مکان کی تعمیر میں ہندوؤں کے تصور کی رعایت کا حکم

سوال:(4)

مکان کی تعمیر میں ہندوؤں کے تصور کے مطابق واستو کی رعایت؛ مکان کے دروازوں اور نئی خریدی گئی گاڑیوں پر لیموں اور مرچ کا ہار بنا کر لٹکانا؛ کیا یہ سب تشبہ میں شامل ہوگا؟

جواب:(4)

اسلام میں کسی بھی ایسے عمل کو اختیار کرنا، جو غیر مسلموں کے مذہبی شعائر، اعتقادات یا رسوم کی مشابہت اختیار کرنے کے زمرے میں آتا ہو، تشبہ بالکفار کہلاتا

ہے۔قرآن وحدیث اور فقہ حنفی کی رو سے تشبہ بالکفار حرام ہے، خصوصاً جب اس میں غیر اسلامی اعتقادات کو اپنانا یا ان کی تقلید شامل ہو۔

۱-قرآن پاک کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا:

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (سورۃ ہود:113)

ترجمہ: "اور ظالموں کی طرف نہ جھکو، ورنہ تمہیں آگ چھو جائے گی"۔

علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ غیر اسلامی عقائد یا رسوم کی طرف جھکاؤ اور ان کی موافقت ممنوع ہے۔

۲-حدیثِ پاک کی روشنی میں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داؤد:4031)

ترجمہ: "جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں شمار ہوگا"۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کی مذہبی یا ثقافتی علامتوں کو اپنانا ناجائز اور گناہ کا سبب ہے۔

۳-فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی کی مستند کتاب "ردالمحتار" میں لکھا ہے:

"التشبه بالکفار فی شعائرهم الدينية حرام بالإجماع" (رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الحظر والإباحۃ، باب کراھیۃ القزع)

ترجمہ: "کفار کے مذہبی شعائر میں مشابہت اختیار کرنا بالاجماع حرام ہے"۔

واستو اور دیگر رسوم کے بارے میں:

واستو کے اصولوں پر مکان بنانا: ہندو مذہب میں واستو شکتی یا واستو دیوتا کی بنیاد پر یہ تصورات قائم ہیں کہ کس طرف مکان بنانا خوش بختی لاتا ہے۔ ان تصورات کو مان کر عمل کرنا شرک کے قریب ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ اللہ پر بھروسہ چھوڑ کر دوسرے عقائد کو اپنانے کے مترادف ہے۔

دروازوں یا گاڑیوں پر لیموں اور مرچ کا ہار لٹکانا: یہ رسم بھی ہندوؤں کے عقائد کا حصہ ہے، جس میں بدروحوں یا نظر بد سے بچنے کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے عمل میں شرکت تشبہ بالکفار اور غلط اعتقادات کو اپنانے کے زمرے میں آتا ہے۔

خلاصہ حکم:

یہ تمام اعمال، جیسے واستو کی رعایت کرنا یا لیموں اور مرچ کا ہار بنانا، تشبہ بالکفار کے زمرے میں آتے ہیں اور حرام ہیں۔ ایک مسلمان کو ان عقائد اور اعمال سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔

نیا سال منانے کا حکم

سوال:(5)

نیا سال منانے کا رواج روز بروز بڑھ رہا ہے اور مسلمان بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں تو کیا یہ عمل تشبہ کے دائرے میں ائے گا؟

جواب:(5)

نئے سال کا جشن منانے کا رواج غیر مسلم معاشروں سے آیا ہے اور یہ ان کے مخصوص تہواروں کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا اس میں شمولیت اختیار کرنا یا اسے منانا تشبہ بالکفار (کافروں کے ساتھ مشابہت) کے دائرے میں آتا ہے، جو کہ شریعت میں ممنوع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُم" (سنن ابی داود، حدیث نمبر:4031)

ترجمہ: "جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے شمار ہوگا"۔

فقہ حنفی میں بھی غیر مسلموں کی مذہبی یا ثقافتی رسومات میں شرکت کو ناپسندیدہ اور ناجائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ اسلامی شناخت کو ختم کرنے اور غیر اسلامی ثقافت کو اپنانے کا سبب بنتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَالتَّشَبُّهُ بِهِمْ فِي شَيْءٍ مِمَّا يَخْتَصُّ بِهِمْ يَكُونُ كُفْرًا، وَفِي غَيْرِهِ

یَکُونُ مَعْصِیَۃً" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج1،ص521)

ترجمہ: "کافروں کی ان چیزوں میں مشابہت جو ان کے دین کے ساتھ خاص ہوں، کفر ہے، اور دیگر امور میں مشابہت گناہ ہے"۔

لہٰذا، نئے سال کا جشن منانا، مبارکباد دینا یا کسی بھی طرح اس کو خوشی کے طور پر منانا غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ نہ صرف تشبہ کے زمرے میں آتا ہے بلکہ اس سے مسلمان اپنی انفرادی دینی شناخت کو کھودیتے ہیں، جو کہ شریعت کے منافی ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان غیر اسلامی تہواروں سے اجتناب کریں اور اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاریں۔

بچوں کی اور شادی کی سال گرہ منانے کا حکم

سوال:(6)

اسی طرح اپنے بچوں کی اور شادی کی سالگرہ منانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(6)

اسلامی شریعت میں تمام افعال اور رسم ورواج کی بنیاد نیت اور شریعت کے مزاج پر منحصر ہے۔ شادی کی سالگرہ یا بچوں کی سالگرہ منانے کا رواج غیر اسلامی ثقافت سے آیا ہے، جو عموماً فضول خرچی، وقت کا ضیاع اور غیر ضروری تقریبات کا ذریعہ بنتا ہے۔

فقہ حنفی اور دیگر اسلامی کتب میں ایسے افعال کو مکروہ یا ناجائز قرار دیا گیا ہے

جو اسلامی ثقافت سے باہر ہوں اور جس میں شرعی احکام کی خلاف ورزی ہو۔علامہ ابن عابدین شامیؒ ردالمحتار میں لکھتے ہیں:

"وكل ما كان من تشبه بالكفار أو ما يفضي إلى إضاعة المال بغير حق أو يؤدي إلى ارتكاب المحرمات فهو من المنكرات والمكروهات"

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، صفحہ 522)

یعنی جو بھی کام کفار کی مشابہت کے سبب ہو، یا مال کے ضیاع کا سبب ہو، یا حرام امور تک لے جائے، وہ منکرات میں سے ہے اور مکروہ ہے۔

شادی کی سالگرہ یا بچوں کی سالگرہ منانے میں نہ تو کسی شرعی حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی نیک مقصد پایا جاتا ہے، بلکہ یہ ایک غیر اسلامی روایت ہے جو فضول خرچی اور وقت کے ضیاع کا سبب بنتی ہے۔

لہٰذا، ایسی تقریبات سے اجتناب کرنا چاہیے۔اگر کوئی خوشی کا اظہار کرنا چاہے تو صدقہ، خیرات یا کسی نیک عمل کے ذریعے کرسکتا ہے، جس میں دین و دنیا دونوں کا فائدہ ہو۔

اپریل فول کا حکم

سوال:(7)

اپریل فول کا کیا حکم ہے؟ جس کا رواج مسلم نوجوانوں میں بھی بڑھتا جارہا ہے؟

جواب:(7)

اپریل فول (April Fool) کا حکم:

اسلامی شریعت میں جھوٹ بولنا مطلقاً حرام ہے، اور جھوٹ کے ذریعے کسی کو دھوکہ دینا یا کسی کا مذاق اڑانا شریعت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اپریل فول کے نام پر جھوٹ بولنا، لوگوں کو تکلیف پہنچانا یا انہیں دھوکہ دینا ایک غیر اسلامی عمل ہے۔

فقہ حنفی اور دیگر اسلامی کتب کی روشنی میں جھوٹ بولنے کی حرمت واضح طور پر بیان کی گئی ہے:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ**" (سورۃ الإسراء:36)

ترجمہ: اور ایسی بات کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

سی طرح جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"**إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صِدِّيقًا، وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ**" (صحیح بخاری:6094، صحیح مسلم:2607)

ترجمہ: سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے، اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں بھی جھوٹ کی مذمت اور اس کے حرام ہونے پر زور دیا

گیا ہے:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"اَلْکَذِبُ حَرَامٌ فِی کُلِّ شَیْءٍ إِلَّا مَا رَخَّصَ الشَّرْعُ فِیهِ" (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الحظر والإباحة، جلد 5، صفحہ 326)

ترجمہ: جھوٹ ہر چیز میں حرام ہے، سوائے اس کے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

خلاصہ:

اپریل فول کے موقع پر جھوٹ بولنا اور کسی کو دھوکہ دینا سخت حرام ہے۔ یہ نہ صرف گناہ ہے بلکہ دوسروں کی دل آزاری اور اذیت کا سبب بننے والا عمل بھی ہے، جو کسی صورت جائز نہیں۔ مسلم نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اس غیر اسلامی رسم سے دور رہیں اور سچائی اور دیانت داری پر قائم رہیں۔

(د) دوسری جنس سے تشبہ:

دوسری جنس سے تشبہ کا حکم

سوال: (1)

آج کل مغرب زدہ خواتین اپنے بال کٹوا کر چھوٹا کرتی ہیں، اس کا کیا

حکم ہے؟ اور اگر یہ درست نہیں ہے تو اس کی ممانعت نص کی وجہ سے ہے یا تشبہ کی وجہ سے؟

جواب:(1)

عورتوں کا اپنے بال چھوٹے کروانا، جیسا کہ آج کل مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بعض خواتین کرتی ہیں، شریعت کی نظر میں جائز نہیں ہے۔ اس کی ممانعت نصوصِ شرعیہ، اسلامی تعلیمات، اور فقہ حنفی کی روشنی میں دو اہم وجوہات کی بنیاد پر ہے:

۱- تشبہ بالرجال (مردوں کے ساتھ مشابہت):

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"لَعَنَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ" (سنن ابی داود، کتاب اللباس، حدیث:۴۰۹۷)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں، اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔

عورت کا بال چھوٹا کروانا مردوں کی مخصوص شکل اختیار کرنے کے مترادف ہے، جو کہ مذکورہ حدیث کی رو سے حرام ہے۔

۲-تشبہ بالکفار (کفار کے ساتھ مشابہت):

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا ہے:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُم" (سنن ابی داود، کتاب اللباس، حدیث:۴۰۳۱)

ترجمہ: جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے۔

چونکہ بال چھوٹے کروانے کا یہ طریقہ مغربی عورتوں کا خاص انداز ہے اور ان کے تہذیبی شعور کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ عمل کفار کی مشابہت کے زمرے میں آتا ہے، جو ممنوع ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی:

فقہ حنفی میں عورتوں کے بال چھوٹے کروانے کو ناجائز کہا گیا ہے۔ امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ویحرم علیها حلق رأسها کما فی البحر عن التتارخانیة، لأنه مثلة وتشبه بالرجال" (ردالمحتار، جلد:۵، ص:۲۷۳، دارالفکر)

ترجمہ: عورت کے لیے سر منڈانا حرام ہے، جیسا کہ البحر سے التتارخانیہ کے حوالے سے نقل کیا گیا، کیونکہ یہ بدنمائی ہے اور مردوں کے ساتھ مشابہت ہے۔

خلاصہ:

عورتوں کے لیے بال چھوٹے کروانا شریعت میں دو وجوہات کی بنا پر ممنوع ہے:

۱-مردوں کے ساتھ مشابہت۔

۲-کفار کی مشابہت۔

یہ عمل ان روایات اور فقہی اصولوں کی روشنی میں ناجائز اور حرام ہے۔ مسلمان عورتوں کو اسلامی وقار اور روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے افعال سے گریز کرنا چاہیے۔

مردوں کا کان اور گلا میں زیور پہننے کا حکم

سوال:(2)

آج کل بہت سے مرد بھی کان اور گلے میں زیور پہنتے ہیں، ہاتھ میں سونا چاندی اور لوہے کا کڑا پہنتے ہیں؛

لیکن اس کی وجہ سے ان کی پہچان مشتبہ نہیں ہوتی ہے اور ان کو مرد کے بجائے عورت نہیں سمجھا جاتا، تو کیا اس کی ممانعت ہوگی؟

جواب:(2)

اسلامی شریعت میں مردوں کے لیے زیورات پہننے کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ مردوں کے لیے خاص طور پر سونا پہننا صریحاً حرام ہے اور چاندی کے زیور میں صرف انگوٹھی جائز ہے، بشرطیکہ اس کا وزن ایک مثقال (ساڑھے چار ماشہ) سے زیادہ نہ ہو۔ دیگر دھاتوں کے زیورات، مثلاً لوہے کا کڑا وغیرہ، مردوں کے لیے مکروہ اور

غیر مناسب ہیں، کیونکہ یہ عورتوں کی مشابہت اور فیشن پرستی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب درمختار میں ہے:

"وتحرم علی الرجال آنیة الذهب والفضة والتحلی بهما" (درمختار مع ردالمحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الأوانی)

یعنی مردوں پر سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنا اور ان کے زیورات پہننا حرام ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں کے لیے سونا اور ریشم کے استعمال کو منع فرمایا:

"حرم لباس الحریر والذهب علی ذكور أمتی وأحل لإناثهم"

(سنن نسائی، کتاب الزینة)

یعنی: میری امت کے مردوں پر ریشم اور سونا حرام ہے اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔

مزید برآں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے:

"لعن الله المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال" (صحیح بخاری، کتاب اللباس)

لہٰذا، اگرچہ ایسے زیورات مرد کی پہچان کو عورتوں سے مشتبہ نہ بھی کریں، تب بھی یہ ناجائز اور مکروہ ہیں، کیونکہ یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت، غیر اسلامی فیشن، اور

سادگی کے اسلامی اصول کے خلاف ہیں۔

جس رنگ کے کپڑے عورتیں پہنتی ہیں مردوں کے لئے پہننے کا حکم

سوال: (3)

بعض دفعہ مرد ایسے شوخ رنگ یا چھینٹ کے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں، جن کو عام طور پر عورتیں پہنتی ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: (3)

ایسے کپڑے جو خاص عورتوں کے لیے مقرر ہوں یا ان کی وضع قطع اور رنگت اس طرح کی ہو جو عورتوں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہو، مردوں کے لیے ان کا پہننا شریعتِ مطہرہ میں ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کی ممانعت کی بنیاد تشبہ بالنساء (عورتوں سے مشابہت اختیار کرنا) پر ہے، جو کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سخت ناپسند کیا گیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لعن اللہ المتشبھین من الرجال بالنساء، والمتشبھات من النساء بالرجال" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 4097)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں، اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

فقہ حنفی میں بھی اس حکم کو واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ردالمحتار میں علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَيُكْرَهُ التَّشَبُّهُ بِالْمَرْأَةِ فِي لِبَاسِهَا، وَهُوَ أَنْ يَلْبَسَ مَا يَخْتَصُّ بِهَا عُرْفًا" (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحظر والإباحۃ، جلد 9، صفحہ 531)

ترجمہ: عورت کے لباس میں مشابہت مکروہ تحریمی ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ مرد ایسا لباس پہنے جو عرفاً عورتوں کے لیے خاص ہو۔

لہٰذا، اگر شوخ یا چھینٹ دار کپڑے عورتوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہوں، تو مردوں کے لیے ان کا پہننا ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت کے زمرے میں آتا ہے۔ تاہم اگر کسی معاشرے میں اس قسم کے کپڑے مردوں کے لیے بھی رائج ہوں اور ان پر عورتوں کا اختصاص نہ ہو، تو پھر اس کی اجازت ہوگی۔

شادیوں میں راجستھانی شیروانی پہننے کا حکم

سوال: (4)

شادیوں میں راجستھانی شیروانی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، ان شیروانیوں کے کپڑے اور ڈیزائن خواتین کے ملبوسات کی طرح ہوتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: (4)

شادیوں میں استعمال ہونے والی راجستھانی شیروانیاں اگر ان کے کپڑے،

رنگ اور ڈیزائن خواتین کے ملبوسات سے مشابہ ہوں یا عرف میں ان کو خواتین کے لباس کے قریب سمجھا جاتا ہو، تو مردوں کے لیے ایسی شیروانیوں کا پہننا شریعتِ مطہرہ میں ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی ممانعت کی بنیاد تشبہ بالنساء (عورتوں سے مشابہت) پر ہے، جو اسلامی تعلیمات کے مطابق سخت گناہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"لعن اللہ المتشبهين من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 4097)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں، اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

فقہ حنفی میں بھی یہ اصول واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان لباس کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ردالمحتار میں علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التَّشَبُّهُ بِالنِّسَاءِ فِي لِبَاسِهِنَّ حَرَام" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الحظر والاِباحۃ، جلد 9، صفحہ 531)

ترجمہ: عورتوں کے لباس میں مردوں کا مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔

راجستھانی شیروانیاں اگر عورتوں کے مخصوص کپڑوں یا ان کی وضع قطع سے مشابہ نہ ہوں اور عرف میں مردوں کے لیے پہنی جاتی ہوں، تو ان کا استعمال جائز ہوگا۔

تاہم اگر ان کا ڈیزائن اور رنگ خواتین کے لباس کے مماثل ہو، تو ایسی شیروانیاں مردوں کے لیے پہننا ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت کے زمرے میں آتا ہے۔

مزید وضاحت:

اسلامی لباس کے اصول یہ ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان ظاہری فرق برقرار رکھا جائے۔ اس لیے ہر ایسا لباس جس سے یہ فرق ختم ہو یا مردوں کی عورتوں سے مشابہت ہو، وہ ممنوع ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر بھی شریعت کے حدود و قیود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور صرف رسم و رواج کی بنیاد پر شریعت کے اصولوں کو نظرانداز کرنا جائز نہیں۔

مردوں کے لئے مہندی لگانے کا حکم

سوال: (5)

مردوں کے مہندی لگانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: (5)

مردوں کے مہندی لگانے کا حکم تفصیل کے ساتھ درج ذیل ہے:

1-سنت یا مستحب مواقع:

مہندی کا استعمال مردوں کے لیے سنت یا مستحب اس وقت ہے جب وہ سنتِ

نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق بالوں یا داڑھی کو سفید ہونے کے بعد رنگنے کے لیے کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفید بالوں کو رنگنے کی ترغیب دی ہے۔ حدیث میں ہے:

"**إن اليهود والنصارى لا يصبغون فخالفوهم**" (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 5899)

ترجمہ: یہود و نصاریٰ اپنے سفید بالوں کو رنگتے نہیں، تم ان کی مخالفت کرو (یعنی رنگ لگاؤ)۔

مرغوب رنگ:

فقہ حنفی کے مطابق اس مقصد کے لیے مہندی یا کوئی اور رنگ استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ کالا رنگ نہ ہو، کیونکہ کالے رنگ کے بارے میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**ويكره الخضاب بالسواد**" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الحظر والإباحۃ، جلد 9، صفحہ 531)

ترجمہ: کالے رنگ سے خضاب کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔

۲- عام زینت کے طور پر مہندی لگانا:

اگر مرد مہندی کو اپنے ہاتھ، پاؤں یا دیگر اعضا پر محض زینت کے لیے لگائیں، جیسا کہ خواتین کرتی ہیں، تو یہ شریعت میں ناجائز ہے، کیونکہ یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت کے زمرے میں آتا ہے، جو کہ ممنوع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لعن اللہ المتشبهين من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر:4097)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں، اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

۳- علاج یا دیگر ضرورت کے لیے مہندی لگانا:

اگر مہندی لگانے کی کوئی معقول ضرورت ہو، جیسے علاج یا جسمانی تقویت کے لیے، تو اس کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ نیت زینت کی نہ ہو اور عرف میں اسے غیر معمولی عمل نہ سمجھا جائے۔

فقہ حنفی کا خلاصہ:

"الحناء فی اللحية والرأس سنة، وفی اليدين والرجلين للرجال مكروه، لأنه من زينة النساء" (الفتاوی الہندیہ، جلد 5، صفحہ 358)

ترجمہ: داڑھی اور سر میں مہندی لگانا سنت ہے، لیکن ہاتھوں اور پاؤں میں مردوں کے لیے مہندی لگانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ عورتوں کی زینت میں سے ہے۔

لہٰذا، مہندی کا استعمال مردوں کے لیے مخصوص حالات میں سنت ہے، لیکن عورتوں کی مشابہت کے طور پر اسے استعمال کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

☆☆☆

مالِ حرام سے متعلق چند غور طلب امور

مال حرام کے متعدد وجوہ کے احکامات

سوال:1(الف)

فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کے حرام ہونے کے متعدد وجوہ ہیں، مثلا: سود، غصب، رشوت، چوری، عقد باطل اور امر معصیت کی اجرت وغیرہ، اس پس منظر میں قابل غور امر یہ ہے کہ مذکورہ ساری وجوہ کا حکم یکساں ہے، یا ان میں باہم کوئی فرق ہے؟ مثلا: جو مال سود، رشوت، اجرت، زنا اور چوری کے ذریعہ حاصل ہو، اس میں اور فعل معصیت، مثلاً: مغنیہ، نائحہ، ڈاڑھی مونڈنے اور تصویر بنانے وغیرہ کی اجرت کے حکم میں فرق ہے؟

اجرت کی حرمت وحلت کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ناجائز فعل پر حق المحنت کے عنوان سے اجرت کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ نیز حرمت لعینہ اور حرمت لغیرہ کا اثر کیا اجرت کے حکم پر بھی پڑے گا؟

جواب:1(الف)

مالِ حرام کے اسباب اوران کے احکام میں فقہ اسلامی نے نہایت باریک بینی سے تفصیل بیان کی ہے۔مذکورہ سوال کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم درج ذیل نکات پر غور کریں:

۱-مالِ حرام کی اقسام:

فقہ کی روشنی میں مالِ حرام دو اقسام پر مشتمل ہوتا ہے:

۱-حرمتِ ذات (حرمتِ لعینہ): ایسا مال جو اپنی ذات میں ہی حرام ہو، جیسے شراب،خنزیر، یا چوری شدہ مال۔

۲-حرمتِ کسب (حرمتِ لغیرہ): ایسا مال جو حلال چیز سے ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، جیسے سود،رشوت، یا دھوکہ۔

۲-حرام مال کے مختلف اسباب:

مالِ حرام کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱-غصب: کسی کی ملکیت زبردستی چھین لینا۔

۲-سود: اضافہ جو بغیر محنت یا تجارت کے لیا جائے۔

۳-رشوت: ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لیے دیا گیا مال۔

۴-چوری: کسی کے مال کو خفیہ طور پر لے لینا۔

۵-معصیت کی اجرت: جیسے گانے بجانے، تصویر کشی، یا داڑھی مونڈنے کی اجرت۔

۳-مختلف اسبابِ حرمت میں فرق:

ان اسباب میں اصولی فرق یہ ہے کہ:

حرمتِ لعینہ: اس کی ممانعت سخت ہے اور اس کا مال کسی بھی صورت حلال نہیں ہوسکتا۔

حرمتِ لغیرہ: اگر کسی نے ناجائز طریقے سے مال حاصل کیا ہو تو اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، لیکن بعض صورتوں میں توبہ کے بعد اس کی ملکیت ممکن ہوسکتی ہے۔

مثال:

سود، چوری، رشوت سے حاصل شدہ مال کو واپس کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ اصل مالک کا حق ہے۔

امرِ معصیت کی اجرت:

ناجائز عمل پر اجرت لینا خود عمل کے ناجائز ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اور اس پر اجرت کا استحقاق نہیں ہے۔

۴-اجرت کی حلت وحرمت کی بنیاد:

اجرت کی حلت وحرمت کی بنیاد یہ ہے کہ جس کام پر اجرت دی جارہی ہو، وہ

شریعت کے نزدیک جائز ہو۔ اگر کام ناجائز ہو، تو اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

فقہ حنفی کا اصول:

فقہاء نے بیان کیا ہے:

"**کل عقد یقتضی الفساد یقتضی عدم الملک**" (درمختار، کتاب البیوع)

یعنی ہر ایسا عقد جو ناجائز ہو، وہ ملکیت کا موجب نہیں ہوسکتا۔

۵-حق المحنت کا جواز:

ناجائز فعل پر حق المحنت کا جواز نہیں نکلتا، کیونکہ اجرت کی شرط کام کا جائز ہونا ہے۔ اگر کام ناجائز ہو تو اجرت بھی ناجائز ہوگی۔

۶-حرمت لعینہ اور حرمت لغیرہ کا اثر:

حرمت لعینہ (ذاتی حرمت) کے تحت حاصل شدہ مال کسی صورت جائز نہیں ہوسکتا، جبکہ حرمت لغیرہ (کسب کی حرمت) کے تحت حاصل مال کو اصل مالک کو لوٹانے کے بعد توبہ کے ذریعے معاف کیا جاسکتا ہے۔

حرام مال میں سے ترکہ کی تقسیم کا حکم

سوال: 1 (ب)

جس شخص کی آمدنی حرام یا مکروہ ہو تو اس کے انتقال کے بعد ورثہ کے لئے

اس کے چھوڑے ہوئے مال کا کیا حکم ہے؟ ورثہ کے لئے پورے مال کا استعمال جائز ہوگا یا بقدر ناجائز صدقہ کرنا ہوگا اور صدقہ کا حکم وجوبی ہے یا استحبابی؟ نیز ورثہ کے غریب یا غنی ہونے کی صورت میں کیا شرعی حکم پر بھی کوئی اثر پڑے گا؟ یعنی اگر ورثہ غریب ہوں، تو کیا ان کے لئے خود ایسا مال استعمال کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

جواب:1(ب)

اگر کسی شخص کی آمدنی حرام یا مکروہ ہو، تو اس کے انتقال کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے مال کا شرعی حکم درج ذیل ہے:

۱-حرام مال کا حکم:

حرام مال کی وراثت جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ مال شرعی طور پر ملکیت میں شمار نہیں ہوتا۔ اگر معلوم ہو کہ مال کا کون سا حصہ حرام ہے، تو اتنے مال کو صدقہ کرنا واجب ہے، اور اس کا استعمال کسی صورت جائز نہیں۔

۲-مشکوک یا مکروہ مال کا حکم:

اگر مال مکروہ طریقے سے حاصل کیا گیا ہو (جیسے ایسی کمائی جو مکروہِ تحریمی کے درجے میں ہو)، تو یہ مال شرعاً ورثہ کو منتقل ہوسکتا ہے۔ لیکن ورثہ کو چاہیے کہ اگر ممکن ہو تو اس مال کو صدقہ کریں، اور اس عمل کو اجر و ثواب کی نیت سے کریں۔

۳-صدقہ کا حکم: وجوبی یا استحبابی؟

حرام مال کے بارے میں: حرام مال کو صدقہ کرنا وجوبی ہے، کیونکہ یہ مال کسی کے لیے بھی جائز استعمال میں نہیں آ سکتا۔

مشکوک یا مکروہ مال کے بارے میں: صدقہ کا حکم استحبابی ہے، اور بہتر یہی ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے تا کہ روحانی پاکیزگی حاصل ہو

۴-ورثہ کی غربت یا خوشحالی کا اثر

اگر ورثہ غریب ہوں:

حرام مال: غریب ورثہ کے لیے بھی حرام مال کا استعمال جائز نہیں ہے۔ انہیں صدقہ کرنا ہی ہوگا۔

مشکوک یا مکروہ مال: اگر ورثہ غریب ہیں اور صدقہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، تو ایسے مال کو استعمال کرنے کی گنجائش دی جا سکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ استطاعت پیدا ہونے پر صدقہ کر دیں۔

۵-فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالہ

فقہ حنفی میں یہ اصول واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ حرام مال شرعی طور پر ملکیت میں داخل نہیں ہوتا اور اس کا استعمال ناجائز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

”المال الحرام ليس له ملك فيه، بل يجب على من حصل بيده أن يتخلص منه بالصدقة“ (ردالمحتار علی الدر المختار: 9/562)

خلاصہ:

ورثہ کو حرام مال سے بچنا ضروری ہے، اور اس مال کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر مال مشکوک یا مکروہ ہو، تو اس کا استعمال غریب ورثہ کے لیے ضرورت کے وقت جائز ہوسکتا ہے، لیکن صدقہ کرنے کو ترجیح دی جائے۔

مال حرام سے خریداری کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال: (2)

احناف کے نزدیک مال حرام سے کوئی چیز خریدنے کی پانچ صورتیں مشہور ومعروف ہیں:

الف: بائع کو حرام رقم پہلے پیش کردی جائے، پھر اس کے ذریعہ خریداری کی جائے۔

ب: حرام رقم کی طرف اشارہ کردیا جائے اور اس کے ذریعہ خریداری کرلی جائے، پھر وہی رقم بائع کو دی جائے۔

ج: حرام رقم کی طرف اشارہ کردیا جائے اور اسی کے ذریعہ خریداری کا عقد بھی کیا جائے لیکن بعد میں ثمن دوسری رقم سے ادا کیا جائے۔

د: عقد کے وقت رقم کا کوئی تذکرہ نہ ہو؛ بلکہ مطلق خریداری کا معاملہ کیا جائے، پھر حرام رقم سے ثمن ادا کیا جائے۔

ہ: بائع کو جائز رقم دکھلا دی جائے، اور اس کے ذریعہ خریداری ہو، لیکن ثمن کی ادائیگی حرام رقم سے کی جائے۔

ان صورتوں میں فقہاء احناف کے درمیان اختلاف ہے، حضرت امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آخری کی تین صورتوں میں گنجائش ہے اور علامہ شامی کی تصریح کے مطابق متأخرین نے فساد زمانہ کی وجہ سے امام کرخی کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے (ردالمحتار کتاب البیوع باب المتفرقات ۵/ ۲۳۵، دارالفکر بیروت)

تو اب سوال یہ ہے کہ امام کرخی کے قول کا مطلب کیا ہے؟ مثلا: اگر کسی شخص نے چوری کی رقم سے کپڑا خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کر دیا تو اس نفع کا کیا حکم ہوگا؟ کیا امام کرخی کے قول کا یہ مطلب ہے کہ تین صورتوں میں بائع کے لیے مطلقا نفع حلال ہوگا، خواہ اس نے مالک کو ضمان ادا نہ کیا ہو؟ یا یہ مطلب ہے کہ نفع اس وقت حلال ہوگا جب کہ بائع مالک کو ضمان ادا کرے؛ خواہ نفع کمانے کے بعد ادا کرے۔

جواب:(2)

احناف کے نزدیک مالِ حرام سے خرید وفروخت کی مذکورہ پانچ صورتوں کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو متأخرین احناف نے فسادِ زمانہ کی وجہ سے بعض صورتوں میں مفتی بہ قرار دیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ تین

صورتوں میں خرید وفروخت کا عقد درست ہوگا، لیکن مالِ حرام کا حکم اپنی جگہ برقرار رہے گا۔

امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب:

امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آخری تین صورتوں میں اگرچہ عقد درست ہے، لیکن اس کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ ان شرائط کی بنیاد پر یہ واضح ہوتا ہے کہ نفع اس وقت حلال ہوگا جب بائع مالک کو ضمان ادا کرے۔ اگر مالک کو ضمان ادا نہیں کیا تو نفع حلال نہ ہوگا۔

چوری کے مال سے نفع کمانا:

اگر کوئی شخص چوری کے مال سے کپڑا خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہے، تو اس صورت میں درج ذیل اصول لاگو ہوں گے:

۱-ضمان ادا کرنا ضروری ہے:

بائع کے لیے نفع اسی وقت حلال ہوگا جب وہ چوری شدہ مال کے مالک کو اس کا حق واپس کر دے یا ضمان ادا کرے۔

۲-بلا ضمان نفع کا حکم:

اگر بائع نے مالک کو ضمان ادا نہیں کیا تو یہ نفع بائع کے لیے حلال نہیں ہوگا، کیونکہ مالِ حرام سے کمایا گیا نفع بھی حرام شمار ہوگا۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالے:

(1) ردالمحتار:

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"**إنه إذا اشترى بالمال الحرام، فإن كان عينه، فإن العقد فاسد ... وإن كان بدله فهو جائز، لكن يجب عليه رد عينه إلى مالكه**" (ردالمحتار، کتاب البیوع، باب المتفرقات، جلد 5، صفحہ 235، دارالفکر بیروت)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد جائز ہونے کے باوجود مال کے مالک کو اس کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

(2) المبسوط للسرخسی:

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"**وإن كان المال الحرام الذي اشترى به من غير مالكه، فحق مالكه متعلق بذمته ...فإن ضمن للمالك ماله كان ما كسبه بعد ذلك له، وإن لم يضمن فهو حرام عليه**" (المبسوط، کتاب البیوع، جلد 13، صفحہ 5، دارالمعرفۃ بیروت)

یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ نفع اسی وقت جائز ہوگا جب مالک کو ضمان ادا کر دیا جائے۔

(3) فتح القدیر:

امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”فإن حصل الربح فی المال الحرام، فإن کان المالک عین ماله قائما فیضمن له ویملک الربح، وإن لم یکن قائما فلا یملک الربح إلا بعد أداء الضمان“ (فتح القدیر، جلد 6، صفحہ 96، دار الفکر بیروت)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع حلال ہونے کے لیے مالک کو ضمان ادا کرنا ضروری ہے۔

خلاصہ:

امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ تین صورتوں میں عقد جائز ہوگا، لیکن نفع اس وقت حلال ہوگا جب بائع چوری شدہ مال کے مالک کو ضمان ادا کرے۔ اگر ضمان ادا نہیں کیا گیا تو نفع حرام ہوگا۔

حرام پیسے سے خریدار کے ہاتھ سامان فروخت کرنے کا حکم

سوال: (3)

اگر کوئی شخص حرام رقم سے سامان خریدے اور بائع کے علم میں ہو کہ مشتری کی کمائی خالص حرام ہے، تو کیا اس کے لئے ایسے شخص کو سامان بیچنا اور قیمت میں حرام رقم وصول کرنا جائز ہے؟ اسی طرح ناجائز کمانے والا اگر اپنے بچوں کی ٹیوشن فیس دے یا ڈاکٹر کی فیس ادا کرے تو ایسے شخص سے فیس وصول کرنے کا کیا حکم ہے؟ اگر جائز ہے تو

اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہاں بھی امام کرخی کے قول کو بنیاد بنایا جائے گا؟ امام کرخی کے قول کا تعلق صرف خریدار اور مستاجر سے ہے یا بائع اور اجیر سے بھی ہے؟

جواب:(3)

آپ کے سوال کا جواب تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱-حرام مال سے سامان خریدنے اور بائع کے لئے حکم۔

۲-ناجائز کمائی والے شخص کی فیس قبول کرنے کا حکم۔

۳-امام کرخی کے قول کی تطبیق اور دائرہ کار۔

۱-حرام مال سے سامان خریدنے کا مسئلہ

فقہ حنفی میں اصول یہ ہے کہ حرام کمائی کا گناہ اس شخص پر ہے جو اس کمائی کو حاصل کر رہا ہے، جبکہ اگر بائع نے مشتری سے سامان بیچا تو بیع کے انعقاد کے بعد مشتری کی طرف سے ادا کی گئی قیمت بائع کے لئے جائز ہوگی، بشرطیکہ وہ مخصوص حرام مال (جیسے چوری شدہ رقم) نہ ہو۔

حوالہ:

۱-علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وأما من باع شيئاً ممن في يده مال حرام فإنه يجوز له أخذ ذلك إذا باعه شيئا في مقابلة ذلك" (البحر الرائق، جلد 6، صفحہ 115، مطبع دار المعرفۃ بیروت)

۲-علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"إذا علم أن ماله حرام فباعه شيئاً و أخذ منه ثمنه جاز له التملک"

(ردالمحتار، جلد 9، صفحہ 629، مطبع دارالفکر بیروت)

۲-ناجائز کمائی والے کی فیس وصول کرنے کا حکم

اگر ناجائز کمانے والا شخص اپنے بچوں کی تعلیم یا علاج کے لئے فیس ادا کرتا ہے تو استاد یا ڈاکٹر کے لئے وہ فیس قبول کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ اجرت ہے اور اجرت کا تعلق عمل سے ہوتا ہے نہ کہ اجرت کی رقم کے ماخذ سے۔

حوالہ:

۱-امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"من استأجر رجلا من ماله الحرام فعمل فيه جاز له أخذ الأجر لأنه كسبه بطريق مباح" (المبسوط، جلد 16، صفحہ 31، مطبع دارالمعرفۃ بیروت)

۲-ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"حرمة المال لا توجب حرمة المعاوضة" (مرقاۃ المفاتیح، جلد 5، صفحہ 142، مطبع دارالکتب العلمیۃ)

۳-امام کرخی کے قول کا دائرہ کار

امام کرخی رحمہ اللہ کا اصول یہ ہے کہ:

"الأجر حلال لمن عمله وإن كان من مال حرام" (اصول الکرخی، صفحہ

120، مطبع دار الفتح)

یہ قول نہ صرف خریدار اور مستاجر پر لاگو ہوتا ہے بلکہ بائع اور اجیر پر بھی اسی اصول کے تحت لاگو ہوتا ہے، کیونکہ اجرت یا قیمت کا تعلق عمل اور معاہدے سے ہے، نہ کہ مال کے ماخذ سے۔

خلاصہ حکم:

حرام کمائی والے سے سامان بیچنے پر بائع کے لئے قیمت لینا جائز ہے، کیونکہ اس کا تعلق معاہدے سے ہے۔

ناجائز کمائی والے کی طرف سے فیس قبول کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ اجرت ہے اور اجرت کا تعلق عمل سے ہے۔

امام کرخی کا اصول ان تمام معاملات پر لاگو ہوتا ہے جن میں معاہدہ جائز ہو اور عمل مشروع ہو۔

حرام وحلال مخلوط مال میں غلبہ کا اعتبار کب ہوگا؟

سوال:(4)

اگر مال حرام و حلال سے مخلوط ہو تو عموماً غلبہ کا اعتبار کر کے حکم لکھا جاتا ہے، اگر غالب مال حلال ہے تو اس سے انتفاع مثلاً: ہدیہ قبول کرنا اور دعوت کھانا وغیرہ جائز ہے؛ اور اگر حرام غالب ہو تو انتفاع ناجائز ہے؛ لیکن غلبہ کا اعتبار خلط مستمیز (مال حلال

اور مال حرام صاحب مال کے پاس الگ الگ ہو) اور غیر متمیز دونوں صورتوں میں ہے یا صرف خلط متمیز کی صورت میں غلبہ کا اعتبار ہوگا؟

اس کا اثر بہت سی شکلوں میں ظاہر ہوگا، مثلاً: اگر کسی نے بھائیوں اور بہنوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا اور بھائیوں اور بہنوں نے معاف کر دیا؛ تو اب مشترک زمین کے غلبہ کا کیا حکم ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہاں مال حلال وحرام الگ الگ نہیں ہے، بلکہ ملک مخلوط اور غیر ممتاز ہے، پس اگر کوئی شخص ایسے غلے سے دعوت کرے، تو کیا اس کی دعوت قبول کرنا اس بنیاد پر جائز ہوگا کہ مشترک غلہ میں اس کا حلال حصہ بھی شامل ہے؟ یا غلبہ کا اعتبار کرتے ہوئے مطلقا دعوت قبول کرنے کو ناجائز کہا جائے گا؟

جواب:(4)

مالِ حرام وحلال کے اختلاط کی صورت میں شرعی حکم کا انحصار اس بات پر ہے کہ مال خلطِ متمیز (یعنی حلال اور حرام الگ الگ معلوم ہو) یا خلطِ غیر متمیز (یعنی حلال وحرام آپس میں اس طرح مخلوط ہو کہ ممتاز نہ ہو) کی صورت میں ہو۔ اس مسئلے کے متعلق تفصیل درج ذیل ہے:

ا-خلطِ متمیز کی صورت میں:

اگر مال حرام اور حلال صاحبِ مال کے پاس ممتاز اور جدا جدا ہو، تو یہاں غلبہ کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر مال کے ساتھ اس کے اپنے حکم کا اعتبار ہوگا۔ یعنی جو حرام مال ہے، اس سے انتفاع جائز نہیں، اور جو حلال ہے، اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

۲-خلطِ غیر متمیز کی صورت میں:

اگر حلال وحرام مال اس طرح مخلوط ہو کہ جدا کرنا ممکن نہ ہو، تو اس صورت میں فقہاء کرام نے غلبہ کا اعتبار کیا ہے:

اگر غالب حصہ حلال ہے، تو ایسے مال سے انتفاع جائز ہوگا۔

اور اگر غالب حصہ حرام ہے، تو انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

یہ اصول متعدد معتبر فقہی کتابوں میں موجود ہے:

دلائل اور فقہی عبارات:

۱-فتاویٰ شامی:

"فَإِنْ كَانَ الْحَرَامُ مَخْلُوطًا بِالْحَلَالِ إِنْ كَانَ غَيْرَ مُمَيِّزٍ يُرَاعَى الْغَالِب" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، صفحہ 559، مطبع: دار الفکر بیروت)

۲-بدائع الصنائع:

"إِذَا اخْتَلَطَ الْحَلَالُ بِالْحَرَامِ فَإِنْ كَانَ كُلٌّ مِنْهُمَا مُمَيِّزًا يَحْرُمُ أَكْلُهُ بِالِاتِّفَاقِ، وَإِنْ كَانَ غَيْرَ مُمَيِّزٍ يُنْظَرُ إِلَى الْغَالِبِ" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 198، مطبع: دار الکتب العلمیہ)

۳-الدر المختار:

"وَإِذَا كَانَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ مَخْلُوطَيْنِ غَيْرَ مُمَيَّزَيْنِ يُعْتَبَرُ الْأَكْثَرُ"

(الدر المختار، جلد 3، صفحہ 300، مطبع: دار الفکر بیروت)

مشترکہ زمین اور غلہ کی دعوت کا مسئلہ:

آپ کے سوال کی دوسری شق، یعنی مشترکہ زمین یا غلے سے دعوت قبول کرنے کا حکم:

اگر زمین یا غلہ میں میراث کا معاملہ ہو، اور تمام شرکاء میں سے کسی کے حصہ میں حرام شامل ہو (مثلاً کسی وارث کو میراث سے محروم کیا گیا ہو)، اور باقی وارثوں نے ان کا حق معاف نہ کیا ہو، تو اس صورت میں:

۱- اگر غلبہ حلال کا ہو، تو اس زمین یا غلے سے دعوت قبول کرنا جائز ہوگا۔

۲- اگر غلبہ حرام کا ہو، تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

نتیجہ اور فتویٰ:

اگر دعوت میں استعمال ہونے والا مال خلط غیر متمیز ہو اور اس میں حرام غالب ہو، تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر غالب حلال ہو، تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔ البتہ، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مال میں شبہ کی بنا پر اجتناب کیا جائے ، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے:

"إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ" (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 52)

ایسی جگہ کاروبار کا حکم جہاں کے اکثر لوگ ناجائز کام کرتے ہوں

سوال:(5)

کسی ایسے مسلم محلے میں دکان وغیرہ کھول کر تجارت کرنا کیسا ہے؟ جہاں کے بیشتر لوگ ناجائز کاروبار (مثلاً: انسانی بالوں کی تجارت، مجسمہ سازی وغیرہ) میں ملوث ہوں؟

جواب:(5)

مسلمانوں کے کسی ایسے محلے میں تجارت کرنا جہاں کے اکثر لوگ ناجائز کاروبار (مثلاً انسانی بالوں کی تجارت یا مجسمہ سازی وغیرہ) میں ملوث ہوں، شریعت کی روشنی میں جائز ہے بشرطیکہ تاجر خود حلال اور جائز تجارت کرے اور اپنے کاروبار میں کسی بھی قسم کے ناجائز عمل کا ارتکاب نہ کرے۔ ساتھ ہی وہ اپنے معاملات اور لین دین میں دیانت داری کا مظاہرہ کرے اور حلال ذرائع سے کمائی کرے۔

البتہ اگر وہاں رہنا یا کاروبار کرنا کسی بڑے شرعی نقصان کا سبب بنے، مثلاً اس کی دینی حالت پر منفی اثر پڑے یا ناجائز کاروبار کے فروغ کا ذریعہ بنے، تو ایسی جگہ کاروبار کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہوگا۔ اس حوالے سے درج ذیل نکات قابل غور ہیں:

ا-خود کا عمل حلال ہو:

تاجر کو اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا ذریعہ معاش اور تجارت مکمل طور

پر شرعی اصولوں کے مطابق ہو اور کسی بھی حرام یا ناجائز عنصر سے پاک ہو۔

۲-ناجائز عمل میں معاونت نہ ہو:

اگر کسی کا کاروبار ان لوگوں کے حرام عمل کو فروغ دیتا ہو یا اس میں کسی قسم کی معاونت کرتا ہو، تو یہ شرعاً جائز نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

(سورۃ المائدہ:2)

ترجمہ: "نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و زیادتی میں مدد نہ کرو"۔

فقہ حنفی کے مستند کتابوں کے حوالہ جات:

ا-فتاویٰ عالمگیری:

"وَإِنْ كَانَ فِي بَيْعِهِ مَعُونَةٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ يُكْرَهُ ذَلِكَ لِلْقَوْلِ بِالْمَنْعِ عَنْ مُعَاوَنَةِ الْعَاصِي" (الفتاوی الہندیۃ، ج3، ص114، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی چیز کی فروخت گناہ پر مددگار ہو تو اس کا بیچنا مکروہ ہوگا کیونکہ گناہ پر مدد کرنا ممنوع ہے۔

۲-ردالمحتار:

"إِذَا كَانَتِ التِّجَارَةُ فِي الْحَلَالِ وَالشَّرِيعة جَازَ مَعَ شَرْطِ السَّلَامَةِ عَنْ شُبْهَةٍ" (ردالمحتار، ج6، ص396، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: جب تجارت حلال اور شریعت کے دائرے میں ہو اور کسی شبہ سے محفوظ ہو تو جائز ہے۔

۳-الدر المختار:

”لَا يَجُوزُ لِأَحَدٍ أَنْ يُقِيمَ بِمَكَانٍ يَزِيدُ فِيهِ عَلَى مَعْصِيَةٍ أَوْ يُعِينُ عَلَيْهَا“

(الدر المختار، ج5،ص 117، مطبع دار الفکر، دمشق)

ترجمہ: کسی کے لیے ایسی جگہ قیام کرنا جائز نہیں جہاں گناہ کا ارتکاب بڑھ جائے یا اس کی مدد ہو۔

خلاصہ:

کسی بھی جگہ تجارت کرنا بذات خود ناجائز نہیں، بشرطیکہ تاجر کا اپنا عمل حلال ہو اور وہ کسی گناہ کے فروغ یا حرام کام میں معاون نہ بنے۔ لیکن اگر کسی جگہ کا ماحول دینی نقصان یا فتنے کا باعث ہو، تو وہاں سے اجتناب کرنا بہتر اور مستحب ہوگا۔

ہدیہ دینے والے کے ذرائع آمدنی کی تحقیق کا حکم

سوال:(6)

اجرت، ثمن اور ہدیہ وغیرہ لیتے وقت کس حد تک آدمی اس بات کا مکلف ہے کہ وہ دینے والے کی آمدنی کے جائز یا ناجائز ہونے کی تحقیق کرے؟

جواب:(6)

شریعت اسلامیہ کی رو سے کسی شخص کے لیے اجرت، ثمن یا ہدیہ قبول کرتے وقت اس بات کی تحقیق کرنا کہ دینے والے کی آمدنی جائز ہے یا ناجائز، اصولی طور پر دو حالات پر منحصر ہے:

1-اگر غالب گمان ہو کہ مال حلال ہے:

اگر دینے والے شخص کے بارے میں کوئی واضح علم یا قوی احتمال نہ ہو کہ اس کی آمدنی حرام ذرائع سے حاصل کی گئی ہے، تو اصولاً اس کی طرف سے دیا ہوا مال لینا جائز ہے۔ شریعت میں لوگوں کی نیتوں کی تفتیش کا حکم نہیں دیا گیا، جب تک کہ واضح طور پر اس کے برعکس کوئی بات سامنے نہ آئے۔

جیسا کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الأصل أن المسلم لا يسأل عن ماله أمن حلال أم من حرام، و لا يفتش عن سبب ملكه له، لأنه لو فتش عن ذلك لعظم الضرر وشق على الناس" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 145، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

۲-اگر غالب گمان ہو کہ مال حرام ہے:

اگر کسی شخص کے بارے میں غالب گمان ہو کہ اس کی آمدنی حرام ذرائع سے ہے، یا واضح علم ہو کہ اس کا مال ناجائز ہے، تو ایسے شخص کا ہدیہ، اجرت یا ثمن قبول کرنا

جائز نہیں ہے۔

ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ویحرم الأخذ ممن یعلم أن ماله حرام محض، فإن كان مشتبها یجوز، و كراهة التنزیه فیه علی قدر الاشتباه" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، صفحہ 530، مطبع: دار الفکر، بیروت)

مزید تفصیل:

۱-حرام مال کا اثر:

حرام مال سے اجرت لینا یا ہدیہ قبول کرنا شرعی اعتبار سے منع ہے، کیونکہ حرام مال کے ذریعے کیے گئے اعمال بھی اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إن الله طیب لا یقبل إلا طیبا" (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 1015)

۲-تحقیق کی حد:

عام حالات میں شریعت نے لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ ہر معاملے میں دینے والے کی کمائی کے ذرائع کی تحقیق کریں، کیونکہ یہ ممکن نہیں اور لوگوں پر سختی ہوگی۔

۳- شک اور یقین کا فرق:

اگر محض شک ہو، تو مال قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یقین یا غالب گمان کی صورت میں اجتناب ضروری ہے۔

جیسا کہ الشیخ نظام الدین اور فقہاء ہند لکھتے ہیں:

"وإذا غلب على الظن أن ماله من الحرام فيكره قبول شيء منه، وإن لم يعلم حاله جاز بلا كراهة" (الفتاوی الہندیۃ، جلد 5، صفحہ 343، مطبع: دار الفکر، بیروت)

خلاصہ:

عام حالات میں تحقیق کا مکلف نہیں، جب تک کہ واضح قرائن یا غالب گمان نہ ہو کہ مال حرام ذرائع سے ہے۔

اگر یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ مال حرام ہے، تو اس سے اجتناب واجب ہے۔

شک کی حالت میں کراہت کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے۔

جی ایس ٹی میں سودی رقم صرف کرنا

جی، ایس، ٹی میں سودی رقم دینے کا حکم

سوال:(1)

جی ایس ٹی میں سرکاری اداروں سے حاصل شدہ سودی رقم صرف کرنا کیسا ہے؟

جواب:(1)

اسلامی شریعت میں سود (ربا) کو سختی سے حرام قرار دیا گیا ہے، اور قرآن وسنت میں سود کی مذمت واضح طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وأحل الله البيع وحرم الربا" (البقرة:275)

جی ایس ٹی میں سودی رقم کا مسئلہ:

جی ایس ٹی یا کسی دیگر حکومتی ٹیکس کے ضمن میں حکومت کی طرف سے حاصل شدہ سودی رقم کے استعمال کا مسئلہ دو پہلو رکھتا ہے:

۱-سودی رقم کا عمومی حکم:

سود کے مال کا لینا اور اس سے فائدہ اٹھانا شریعت میں قطعی طور پر ناجائز ہے۔فقہ حنفی کی روشنی میں بھی اس کی ممانعت موجود ہے:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وأما أخذه (الربا) على وجه المعاوضة، فحرام بالإجماع" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 197، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

۲-سرکاری اداروں سے ملنے والی سودی رقم کا استعمال:

اگر سرکاری ادارے کی طرف سے سودی رقم ملتی ہے تو اس رقم کو ذاتی استعمال میں لانا ناجائز ہے، کیونکہ وہ مال خبیث اور حرام ہے۔اس کے بجائے یہ رقم نیک مقاصد کے لیے خرچ کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس سے ذاتی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"أما الحرام فلا يملك بالقبض بل يجب عليه التصدق به إذا كان يجهل مالكه" (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 4، صفحہ 208، مطبع: دار الفکر، بیروت)

۳-سودی رقم کو خیراتی کاموں میں خرچ کرنے کا حکم:

فقہاء کرام کے مطابق، ایسی رقم جس کا مالک معلوم نہ ہو، یا جو سرکاری اداروں کی جانب سے سود کے طور پر ملے، اسے صدقہ کر دینا واجب ہے۔البتہ اس

سے ذاتی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

شیخ نظام الدین اور دیگر فقہاء ہند لکھتے ہیں:

"المال الحرام الذی لا یعلم مالکہ یجب التصدق به علی الفقراء والمصالح العامة" (الفتاوی الہندیۃ، جلد 3، صفحہ 127، مطبع: دار الفکر، بیروت)

جی ایس ٹی میں سودی رقم کے مصرف کی رہنمائی:

۱- جی ایس ٹی میں حاصل شدہ سودی رقم کو ذاتی استعمال میں لانا یا حکومتی واجبات ادا کرنے کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۲- اس رقم کو بلا نیت ثواب فقراء و مساکین یا عام رفاہی کاموں میں خرچ کر دینا چاہیے۔

۳- اس رقم کو دینی اداروں، مسجد، یا قرآن کی طباعت وغیرہ میں استعمال کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ ناپاک مال ہے، جو نیک کاموں کے لیے موزوں نہیں۔

شیخ عبدالرحمن الجزیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مال الربا لا یصح استعماله فی مصالح دینیة، بل یقتصر علی التصدق علی الفقراء بغیر نیت الثواب" (کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ، جلد 2، صفحہ 387، مطبع: دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

خلاصہ:

جی ایس ٹی یا کسی بھی سرکاری ٹیکس کے ضمن میں ملنے والی سودی رقم کو ذاتی

استعمال میں لانا یا حکومتی واجبات ادا کرنے کے لیے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔اس رقم کو بلا نیت ثواب فقراء یا عام رفاہی کاموں میں خرچ کرنا واجب ہے۔

جی،ایس،ٹی میں سودی رقم کون دے سکتا ہے؟

سوال:(2)

اگر گنجائش ہے تو کس کے لیے؟ گاہک کے لیے یا تاجر کے لیے؟ گاہک کی طرف سے ادا کردہ پوری رقم سامان کا ثمن شمار ہوگی یا جی ایس ٹی کے بقدر رقم کا حصہ ناروا ٹیکس مانا جائے گا؟

جواب:(2)

جی ایس ٹی (گڈز اینڈ سروسز ٹیکس) کے مسئلے کی وضاحت:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، جب کوئی ٹیکس حکومت کی طرف سے عوامی مفاد کے لیے لگایا جائے اور یہ ٹیکس شریعت کے عمومی اصولوں کے خلاف نہ ہو، تو اس کی ادائیگی کرنا رعایا کے لیے ضروری ہوسکتی ہے۔تاہم، اگر ٹیکس ظالمانہ یا غیر ضروری ہو، تو فقہاء نے ایسے ٹیکس کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ حیثیت میں دیکھا ہے۔

سوال کا تجزیہ:

ا-گاہک اور تاجر کا تعلق:

جی ایس ٹی کی ادائیگی کے وقت تاجر گاہک سے وصول کردہ ٹیکس کو حکومت تک پہنچانے کا محض ذریعہ ہے۔

۲-جی ایس ٹی کی نوعیت:

فقہ اسلامی میں اس بات کی وضاحت ہے کہ اگر حکومت جائز مقاصد کے لیے ٹیکس عائد کرے تو وہ شرعاً ممنوع نہیں ہوگا، بشرطیکہ اس میں ظلم وزیادتی نہ ہو۔

گاہک کے لیے گنجائش:

گاہک کے لیے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ حکومت کے عائد کردہ ٹیکس کو ادا کرے، کیونکہ یہ خرید وفروخت کے لیے ضروری شرط بن چکا ہے اور گاہک کو شرعاً اس کے ادا کرنے پر گناہ گار نہیں کہا جائے گا۔ اس کی مثال فقہ حنفی میں بعض اضافی اخراجات کو گوارا کرنے کے اصول سے ملتی ہے۔

تاجر کے لیے گنجائش:

تاجر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جی ایس ٹی کی مد میں رقم گاہک سے وصول کرے، بشرطیکہ وہ اسے حکومت کے پاس جمع کروانے کا پابند ہو، کیونکہ یہ اس کے کاروبار کی قانونی ضرورت ہے۔

پوری رقم کا حکم:

گاہک کی طرف سے ادا کردہ پوری رقم کو سامان کا ثمن تصور کیا جائے گا،

کیونکہ وہ جی ایس ٹی بھی سامان کی خریداری کے لیے ادا کر رہا ہے، اور اس کے بغیر خرید وفروخت ممکن نہیں۔

جی ایس ٹی کو الگ سے ناجائز رقم کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ تاجر گاہک سے اس رقم کو اپنے لیے نہیں بلکہ حکومت کے لیے وصول کرتا ہے۔

فقہ حنفی کے اصول اور حوالہ جات:

۱-امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"کل ما کان مستحقاً للحکومة، فإذا أُخذ علی وجه المشروع، فهو جائز شرعاً" (المبسوط، جلد 12، ص 203، مطبع دار المعرفۃ بیروت)

یعنی جو چیز حکومت کے حق میں ہو اور وہ مشروع طریقے سے وصول کی جائے، وہ شرعاً جائز ہے۔

۲-علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

"کل عقد یلزم فیه شیء بغیر ظلم، فهو جائز بشرط رضا الطرفین" (البحر الرائق، جلد 6، ص 148، مطبع دار احیاء التراث العربی)

یعنی ہر ایسا معاہدہ جو ظلم کے بغیر ہو اور فریقین کی رضامندی سے ہو، جائز ہے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری:

"وإن کانت الضرائب توضع للمصالح العامة، فلا بأس بها إذا لم یکن فیها ظلم" (جلد 2، ص 315، مطبع دار الفکر بیروت)

نتیجہ:

گاہک کے لیے: گاہک کی طرف سے ادا کردہ پوری رقم کو سامان کا ثمن شمار کیا جائے گا، اور وہ اس ٹیکس کی ادائیگی میں گناہ گار نہیں ہوگا۔

تاجر کے لیے: تاجر کے لیے گاہک سے جی ایس ٹی وصول کرنا شرعاً جائز ہے ، کیونکہ وہ حکومت کی طرف سے متعین ہے اور تاجر اس کا براہ راست فائدہ نہیں اٹھا رہا۔

جی، ایس، ٹی کے عوض سودی رقم اپنے استعمال میں لانے کا حکم

سوال:(3)

اگر جی ایس ٹی پہلے جمع کر دیا گیا اور بعد میں سودی رقم حاصل ہوئی تو کیا جمع کی ہوئی رقم کے بقدر سودی رقم سے انتفاع کی گنجائش ہوگی؟

جواب:(3)

سوال کی وضاحت:

یہ مسئلہ ان حالات سے متعلق ہے جب کوئی شخص کسی جائز یا ناگزیر سرکاری معاملے میں جی ایس ٹی (یا دیگر قانونی ٹیکسز) ادا کرتا ہے، اور اس کے بعد اسے سودی رقم حاصل ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا پہلے سے جمع شدہ رقم کے بقدر سودی رقم کو کسی شرعی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہوگا؟

فقہ حنفی کی روشنی میں جائزہ:

فقہ حنفی میں مالِ حرام، بالخصوص سودی مال، کے استعمال کے متعلق سخت ممانعت وارد ہے۔سودی مال کو ناپاک اور غیر قابل انتفاع قرار دیا گیا ہے، اور کسی بھی صورت میں اس کا ذاتی فائدے کے لیے استعمال جائز نہیں ہے۔

سودی رقم سے انتفاع کی عمومی ممانعت:

فقہاء کرام نے فرمایا:

"الربا أكله واستعماله من الكبائر، وهو محرم تحريماً قطعياً" (الھدایہ، جلد 3، ص 65، مطبع دار الاحیاء التراث العربی)

یعنی سود کھانا اور استعمال کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ قطعی طور پر حرام ہے۔

لہٰذا، سودی رقم کو کسی بھی ذاتی یا اجتماعی فائدے میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، خواہ وہ پہلے سے جمع شدہ قانونی واجبات کے بقدر ہی کیوں نہ ہو۔

جی ایس ٹی کے برابر سودی رقم کے استعمال کا شرعی حکم:

فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق سودی رقم کا حکم:

سودی مال کسی بھی حالت میں حلال نہیں ہوتا۔اگر چہ جی ایس ٹی کی ادائیگی پہلے ہو چکی ہو، تب بھی سودی رقم کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

۲-حاصل کردہ سودی رقم کا مصرف:

سودی رقم کا صرف وہی مصرف جائز ہے جس میں ذاتی یا کسی دوسرے مسلمان کے فائدے کا کوئی پہلو نہ ہو، جیسے صدقہ کرنا بغیر ثواب کی نیت کے۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"الحرام لا يملک، ولا يحل الانتفاع به إلا في المواضع المضطرة" (البحر الرائق، جلد 5، ص 194، مطبع دار احیاء التراث العربی)

یعنی حرام مال کسی کی ملکیت نہیں بن سکتا اور اس سے انتفاع بھی صرف سخت مجبوری میں جائز ہے۔

۳-جی ایس ٹی کے برابر رقم کا مسئلہ:

اگر جی ایس ٹی یا کسی دیگر قانونی ٹیکس کے بقدر سودی رقم حاصل ہوئی ہو، تو بھی یہ رقم ذاتی استعمال یا واجبات کی ادائیگی میں خرچ نہیں کی جا سکتی۔ اس رقم کو کسی مستحق فقیر کو صدقہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ذاتی فائدے یا ریاستی ٹیکس کی ادائیگی کے لیے استعمال کرنا شرعاً ممنوع ہوگا۔

شرعی اصول:

۱-درمختار:

"المال الحرام لا يملک بالقبض، بل يجب على قابضه أن يردّه

إلى مالكه، فإن لم يجد مالكه، تصدق به" (درمختار مع ردالمحتار، جلد 6، ص 385، مطبع دارالفکر)

یعنی حرام مال قبضے میں آ جانے کے باوجود ملکیت نہیں رکھتا، اور اسے اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، اور اگر مالک نہ ملے تو صدقہ کرنا لازم ہے۔

۲-فتاویٰ عالمگیری:

"إذا كان في يده مال الربا، لا يجوز له أن يستعمله في حوائجه، بل يجب أن يتصدق به" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص 187، مطبع دارالفکر)

سودی مال کو اپنی ضروریات میں استعمال کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

نتیجہ:

۱-سودی رقم سے جی ایس ٹی یا کسی اور واجب الادا رقم کے بقدر انتفاع کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ سودی مال کا ذاتی فائدے میں استعمال قطعی حرام ہے۔

۲-سودی رقم کو صدقہ کر دیا جائے، لیکن اس پر کسی بھی قسم کے ثواب کی نیت نہ کی جائے۔

۳-شرعاً ضروری ہے کہ مسلمان سود سے مکمل اجتناب کرے اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے جہاں سودی رقم کا حصول لازم آئے۔

جی ایس ٹی میں سود کا کچھ حصہ دینے کا حکم

سوال:(4)

بسا اوقات تاجر جی ایس ٹی ملحوظ رکھ کر سامان فروخت کرتا ہے؛ لیکن گاہک کو پکا بل نہیں دیتا ہے؟ بلکہ بغیر بل کے یا کچے بل کے ساتھ سامان فروخت کر دیتا ہے، ایسی صورت میں کیا گاہک کے لیے سودی رقم کا کچھ حصہ جی ایس ٹی میں دینے کی نیت سے شامل کرنا درست ہوگا؟

جواب:(4)

سوال کی وضاحت:

اس صورت میں تاجر جی ایس ٹی کو سامان کی قیمت میں شامل تو کرتا ہے، لیکن پکا بل فراہم نہیں کرتا۔ یہ عمل قانوناً اور شرعاً درست نہیں کیونکہ تاجر کی یہ حرکت دھوکہ دہی اور حکومتی قوانین کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا گاہک ایسی صورت میں جی ایس ٹی کی رقم کے طور پر سودی مال کو استعمال کر سکتا ہے؟

فقہ اسلامی میں سودی مال کے استعمال کا حکم:

فقہ حنفی اور دیگر مکاتب فکر کے نزدیک، سودی مال کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرنا شرعاً ممنوع ہے، خواہ وہ کسی ذاتی یا غیر ذاتی ضرورت کے لیے ہو۔ سود کی

حرمت قرآن وسنت سے ثابت ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" (البقرہ:278)

یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو۔

گاہک کی حیثیت اور جی ایس ٹی کی رقم:

۱-جی ایس ٹی کی حقیقت:

جی ایس ٹی حکومت کا عائد کردہ ایک قانونی ٹیکس ہے جسے گاہک کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے اور تاجر حکومت کے لیے وصول کرتا ہے۔

۲-تاجر کا غلط رویہ:

اگر تاجر پکا بل فراہم نہیں کرتا، تو یہ اس کی ذمہ داری اور غلطی ہے، لیکن گاہک پر اس کا اثر صرف اتنا ہوگا کہ وہ قانوناً پکا بل حاصل کرنے کا مطالبہ کرے۔

۳-سودی رقم کے استعمال کی ممانعت:

سودی رقم کو جی ایس ٹی یا کسی بھی دوسرے مقصد میں استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، چاہے تاجر کے رویے میں کجی موجود ہو۔ فقہ حنفی کی تصریحات کے مطابق، سودی

مال سے انتفاع مطلقاً ممنوع ہے۔

فقہ حنفی کے دلائل:

۱- درمختار:

"الحرام لا يملك بالقبض، ولا يحل الانتفاع به، إلا إذا تعذر الرد، فيتصدق به" (درمختار مع ردالمحتار، جلد 6، ص 385، مطبع دار الفکر)

یعنی حرام مال قبضے میں آ جانے کے بعد بھی مالکیت میں نہیں آ تا، اور اس سے انتفاع جائز نہیں، سوائے اس کے کہ واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو صدقہ کر دیا جائے۔

۲- فتح القدیر:

"ويحرم الانتفاع بالربا ولو في غير حاجته؛ لأنه خبيث بنص القرآن" (فتح القدیر، جلد 5، ص 21، مطبع دار الفکر)

سودی مال سے کسی بھی قسم کا انتفاع حرام ہے، چاہے وہ ذاتی ضرورت کے لیے نہ ہو، کیونکہ یہ قرآن کی نص کے مطابق ناپاک ہے۔

۳- فتاوی عالمگیری:

"مال الربا يجب التخلص منه، ولا يجوز صرفه في حوائج المسلمين" (فتاوی عالمگیری، جلد 3، ص 188، مطبع دار الفکر)

سودی مال سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے اور اسے مسلمانوں کی ضروریات میں خرچ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

گاہک کے لیے حکم:

۱- گاہک کے لیے جی ایس ٹی کی ادائیگی کے لیے سودی مال کو استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ سودی مال سے کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانا مطلقاً حرام ہے۔

۲- گاہک کو چاہیے کہ وہ تاجر سے پکا بل طلب کرے تاکہ جی ایس ٹی کی رقم درست طریقے سے حکومت کو منتقل ہو۔

نتیجہ:

سودی رقم کو جی ایس ٹی کی ادائیگی میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، خواہ تاجر پکا بل فراہم کرے یا نہ کرے۔

گاہک کو چاہیے کہ ایسی صورت میں اپنے معاملات شفاف رکھے اور سودی مال کو کسی شرعی مصرف میں، جیسے صدقہ بلانیتِ ثواب، استعمال کرے، لیکن جی ایس ٹی یا دیگر ذاتی ضروریات کے لیے نہیں۔

دکاندار کا جی ایس ٹی نہ ادا کرنے کا حکم

سوال:(5)

دکاندار بسا اوقات ایسا بھی کرتا ہے کہ گاہک سے تو جی ایس ٹی وصول کر لیتا ہے، لیکن بعد میں کسی تدبیر کے ذریعے ریٹرن فائل نہیں کرتا، ایسی صورت میں جی

ایس ٹی کے عنوان سے وصول کی ہوئی رقم کو سامان کی مکمل قیمت کا حصہ قرار دے کر دکاندار کے لیے رکھنا جائز ہوگا؟ اگر نہیں تو اتنی رقم کا مصرف کیا ہوگا؟

جواب:(5)

سوال کی وضاحت:

یہ سوال اس صورت حال سے متعلق ہے جہاں دکاندار گاہک سے جی ایس ٹی کی رقم وصول کر لیتا ہے لیکن وہ حکومت کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت ریٹرن فائل نہیں کرتا، یعنی حکومت کو جی ایس ٹی کی مد میں کوئی رقم جمع نہیں کراتا۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں دکاندار کے لیے یہ رقم اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں، اور اگر جائز نہیں تو اس رقم کا شرعی مصرف کیا ہوگا؟

جی ایس ٹی کی حیثیت:

ا- شریعت میں امانت اور دیانت کی حیثیت:

جی ایس ٹی کی رقم دکاندار کے پاس ایک امانت ہے، جو حکومت کے حق میں وصول کی گئی ہے۔ شریعت میں امانت کا حکم یہ ہے کہ اسے اسی مصرف میں خرچ کیا جائے جس کے لیے اسے وصول کیا گیا ہو۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا" (النساء:58)

یعنی اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچاؤ۔

۲-دھوکہ دہی کی ممانعت:

گاہک سے جی ایس ٹی وصول کرنے کے باوجود حکومت کو ادا نہ کرنا شرعاً اور قانوناً خیانت اور دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے۔

اس عمل کو اسلامی تعلیمات اور فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت سختی سے منع کیا گیا ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں حکم:

۱-جی ایس ٹی کی رقم کا حکم:

دکاندار کے لیے جی ایس ٹی کی مد میں وصول کی گئی رقم کو اپنی ذاتی ملکیت میں لانا یا اپنے کاروبار میں استعمال کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ رقم حکومت کی طرف سے واجب الادا ہے اور اس کا حق صرف حکومت کو ہے۔

۲-دکاندار کی خیانت:

دکاندار کا حکومت کے قوانین سے بچنے کے لیے جی ایس ٹی کی رقم کو ریٹرن فائل نہ کرنا شریعت کی رو سے خیانت اور غبن شمار ہوگا۔

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

"إذا قبض المال على وجه الأمانة، فصرفه في غير محله، كان خيانة" (ردالمحتار، جلد 4، ص130، مطبع دارالفکر)

یعنی اگر کسی نے مال امانت کے طور پر وصول کیا اور اسے غیر متعلقہ جگہ خرچ

کیا تو یہ خیانت ہے۔

جی ایس ٹی کے عنوان سے وصول شدہ رقم کا مصرف:

۱-حکومت کو لوٹانا واجب:

اگر دکاندار کے پاس جی ایس ٹی کی رقم باقی ہو تو اسے فوراً حکومت کو ادا کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ حکومت کا حق ہے۔

۲-اگر حکومت کو ادا نہ کر سکے:

اگر کسی وجہ سے حکومت کو یہ رقم ادا کرنا ممکن نہ ہو، تو اسے فقراء اور مستحقین میں صدقہ کر دینا چاہیے۔

صدقہ کرتے وقت دکاندار کو کسی بھی قسم کے ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ مال اس کی ملکیت نہیں تھا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"إذا تعذر رد المال إلى صاحبه، يجب صرفه في سبيل الله بلا نية الثواب" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص 188، مطبع دار الفکر)

۳-جی ایس ٹی کی رقم کو سامان کی قیمت کا حصہ قرار دینا:

دکاندار کے لیے یہ رقم سامان کی قیمت کا حصہ قرار دینا اور اسے اپنے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ وصولی ہی حکومت کی امانت کے طور پر کی گئی ہے، نہ کہ سامان کے ثمن کے طور پر۔

نتیجہ:

۱-دکاندار کے لیے جی ایس ٹی کی مد میں وصول کی گئی رقم کو حکومت کے مقررہ اصولوں کے مطابق جمع کرانا ضروری ہے۔

۲-اگر دکاندار حکومت کو یہ رقم ادا نہ کرے تو اس کا ذاتی استعمال حرام ہوگا۔

۳-ایسی رقم کو کسی مستحق شخص کو صدقہ کر دینا چاہیے، لیکن دکاندار کے لیے اس پر ثواب کی نیت کرنا درست نہیں ہوگا۔

۴-دکاندار کو چاہیے کہ آئندہ اس قسم کی خیانت سے مکمل پرہیز کرے، کیونکہ یہ عمل دینی اور دنیاوی نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔

فقہی حوالہ جات:

۱-درمختار مع ردالمحتار، جلد 4، ص 130، مطبع دارالفکر

۲-البحر الرائق، جلد 5، ص 119، مطبع دارالفکر

۳-فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص 188، مطبع دارالفکر

غیر واجبی ٹیکس میں سودی رقم دینے کا حکم

سوال:(6)

سود کے مصرف کے بارے میں بالعموم یہ لکھا جاتا ہے کہ ثواب کی نیت کے

بغیر غرباء کو دے دیا جائے، اب اگر ناروا ٹیکسوں کے ذریعے رد الی المالک کی شکل موجود ہو تو کیا ان ٹیکسوں میں سودی رقم صرف کرنے کو ضروری قرار دیا جائے گا یا اختیار ہو گا؟

جواب:(6)

سوال کی وضاحت:

سوال کا تعلق سودی رقم کے ممکنہ مصرف سے ہے، جہاں کہا جاتا ہے کہ سودی مال کو بغیر نیتِ ثواب فقراء و مساکین میں صدقہ کیا جائے۔ تاہم، اگر ناروا ٹیکسوں یا دیگر حکومتی مطالبات (جنہیں رد الی المالک کی صورت قرار دیا جا سکتا ہو) میں سودی رقم استعمال کرنے کا موقع موجود ہو، تو کیا اس صورت میں سودی رقم کا استعمال ضروری ہو گا یا اختیاری؟

سودی رقم کی شرعی حیثیت:

سودی رقم کسی مسلمان کے لیے ناپاک اور حرام ہے، اور اس کا ذاتی فائدے کے لیے استعمال مکمل طور پر ممنوع ہے۔ اس کے صرف دو ممکنہ شرعی مصارف ہیں:

ا-رد الی المالک (مالک کو واپس کرنا):

سودی رقم کو اصل مالک تک پہنچانا، اگر مالک کا تعین ممکن ہو۔

۲-تصفیہ فی غیر الثواب (بغیر نیتِ ثواب صدقہ کرنا):

اگر اصل مالک کا پتہ نہ ہو، تو اس رقم کو فقراء میں صدقہ کیا جائے، لیکن ثواب کی نیت نہ کی جائے۔

فقہ حنفی میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

"مال الربا لا يحل الانتفاع به، بل يجب دفعه إلى مالكه، فإن لم يوجد يصرف في مصالح المسلمين أو يتصدق به على الفقراء" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 6، ص 385، مطبع دار الفکر)

سودی رقم کو نارواٹیکس میں استعمال کرنا:

۱-نارواٹیکس کی نوعیت:

نارواٹیکس، جیسا کہ غیر ضروری حکومتی محصولات، ایک ظلم اور ناجائز مالی بوجھ کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ تاہم، یہ بھی حکومت کا ایک مطالبہ ہے، جو قانونی دائرہ میں آتا ہے۔ فقہاء نے ایسی صورتحال میں مسلمانوں کو حتی الامکان جائز طریقوں سے اس بوجھ کو کم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

۲-سودی رقم کا استعمال:

اگر سودی رقم کو کسی ایسے مصرف میں لگایا جا سکتا ہو جو حکومت یا دیگر غیر مسلم

اداروں کے ناروا مطالبات کی ادائیگی کے لیے ہو، تو یہ ایک اختیاری مصرف ہوگا۔ لیکن سودی مال کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اصل مصرف فقراء ہیں۔

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

"ویجوز صرف مال الربا فی کل ما لا یعود بنفع علی قابضه، كإصلاح الطرقات، أو دفع الظلم عن المسلمين" (ردالمحتار، جلد 6، ص 386، مطبع دارالفکر)

یعنی سودی مال کو ہر ایسے مصرف میں خرچ کیا جا سکتا ہے جس سے اس کے قابض کو کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو، جیسے راستوں کی درستگی یا مسلمانوں سے ظلم کو دور کرنا۔

ضروری یا اختیاری ہونے کی وضاحت:

۱-ضروری نہیں:

سودی رقم کو ناروا ٹیکس میں صرف کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے، کیونکہ اصل مصرف فقراء کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کرنا ہے۔

۲-اختیاری ہے:

اگر کوئی شخص چاہے تو ناروا ٹیکس جیسے مصارف میں سودی رقم استعمال کر سکتا ہے، بشرطیکہ اسے ذاتی فائدے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال نہ

کرے۔ یہ اختیار شریعت کے عمومی اصولوں سے متصادم نہیں۔

۳-افضل عمل:

بہتر یہ ہے کہ سودی رقم کو فقراء کے لیے صدقہ کر دیا جائے، کیونکہ یہ قرآن وسنت کے مزاج کے زیادہ قریب ہے۔

فقہی حوالہ جات:

۱-الفتاوی الہندیہ:

"إن لم يجد صاحب الربا، يصرف في مصالح المسلمين بلا نية الثواب" (الفتاوی الہندیہ، جلد 3، ص188، مطبع دار الفکر)

یعنی اگر سود کا مالک نہ ملے تو اسے مسلمانوں کی مصلحت میں بغیر نیتِ ثواب کے خرچ کیا جائے۔

۲-فتح القدیر:

"يجوز دفع المال الحرام إلى الظالم إذا أخذ منه قهراً، لأنه في الحقيقة يتخلص من الإثم" (فتح القدیر، جلد 6، ص60، مطبع دار الفکر)

یعنی حرام مال کو ظالم (حکومت) کو دینا جائز ہے، کیونکہ یہ گناہ سے بچنے کی صورت ہے۔

۳-البحر الرائق:

"لا يجوز للمسلم الانتفاع بمال الربا، بل يجب التصدق به على

المحتاجين" (البحرالرائق ،جلد6،ص21،مطبع داراحیاءالتراث العربی)

مسلمان کے لیے سودی مال سے انتفاع جائز نہیں، بلکہ اسے ضرورت مندوں پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

نتیجہ:

۱-سودی رقم کو ناروا ٹیکس میں صرف کرنا شرعاً اختیاری ہے، لیکن اسے فقراء میں صدقہ کرنا زیادہ مستحب اور افضل ہے۔

۲-اگر سودی مال کو ناروا ٹیکس میں استعمال کیا جائے ،تو یہ صرف ظلم کو کم کرنے کی نیت سے ہو، اور اس پر کسی قسم کے ذاتی فائدے کی گنجائش نہ ہو۔

۳-سود سے بچنا اور اپنے مالی معاملات کو شریعت کے مطابق رکھنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

ہیلتھ انشورنس کے چند قابلِ غور پہلوؤں کی تنقیح

ہیلتھ انشورنس کا حکم

سوال:(1)

موجودہ حالات میں امراض کی کثرت وتنوع اور تشخیص وعلاج کی گرانی کی وجہ سے ہیلتھ انشورنس عام لوگوں کی ایک ضرورت بنتا جارہا ہے تو کیا عوام کی حاجات ومصالح کے پیش نظر ہیلتھ انشورنس کے جواز کی کوئی شکل نکل سکتی ہے؟ بالخصوص ان ممالک میں، جہاں معاشی اور اقتصادی نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے؛ اور ان کی اکثریت غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے کی وجہ سے مہنگے علاج کی متحمل نہیں ہے۔

جواب:(1)

اسلامی شریعت میں مالی معاملات میں اصول یہ ہے کہ ہر وہ عقد یا معاملہ جو غرر، دھوکہ یا جوا پر مشتمل ہو، وہ ناجائز ہے، کیونکہ اس میں غیر یقینی اور ظلم شامل ہوتا ہے۔ انشورنس کے عمومی نظام کو فقہاء نے جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ یہ عقد غرر اور قمار (جوئے) پر مبنی ہے۔ تاہم، موجودہ دور کے خاص حالات اور ضرورت کے پیش نظر ہیلتھ انشورنس کے جواز کے امکانات پر علماء نے بحث کی ہے۔

ہیلتھ انشورنس کی ضرورت اور عمومی حکم:

ہیلتھ انشورنس میں فریقین (عموماً انشورنس کمپنی اور فرد) ایک معاہدہ کرتے ہیں، جس میں فرد مخصوص رقم (پریمیم) ادا کرتا ہے اور کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ وہ علاج کے اخراجات پورے کرے گی۔ اس نظام میں درج ذیل مسائل پائے جاتے ہیں:

۱-غرر (غیر یقینی): علاج کے اخراجات کے حوالے سے کوئی یقینی اندازہ نہیں ہوتا کہ کمپنی کو کیا دینا ہوگا اور کس حد تک دینا ہوگا۔

۲-قمار (جواء): یہ معاہدہ بعض صورتوں میں جوئے کی طرح ہوتا ہے، کیونکہ ادائیگی اور فائدہ اٹھانے کا دارومدار ممکنہ حادثات اور بیماریوں پر ہوتا ہے۔

ضرورت اور حاجت کے پیش نظر حکم:

فقہ اسلامی میں ایک اصول یہ ہے کہ ضرورت اور شدید حاجت کی صورت میں بعض ناجائز امور کو محدود پیمانے پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ فقہاء نے فرمایا:

"**الضرورات تبيح المحظورات**" (فتح القدیر، جلد 2، صفحہ 352، دار الفکر بیروت)

نیز حاجت عامہ کو ضرورت کے درجے میں شمار کیا جاتا ہے:

"**الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة**" (الاشباہ والنظائر، صفحہ 85، دار الکتب العلمیۃ)

اس بنیاد پر اگر کسی علاقے یا ملک میں:

۱- علاج کے اخراجات بہت زیادہ ہوں۔

۲-عوام غربت کی وجہ سے مہنگے علاج کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔

۳-حکومت کی طرف سے کوئی مؤثر علاج کا انتظام نہ ہو۔

تو اس صورت میں حاجت عامہ کے تحت ایسے انشورنس کو اختیار کرنا بقدر ضرورت جائز قرار دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ:

۱-یہ مکمل طور پر اختیاری ہو۔

۲-اس سے صرف علاج کے اخراجات پورے کیے جائیں۔

۳-اسے حلال متبادل کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جائے، مثلاً اسلامی تکافل نظام۔

دلائل کی روشنی میں فقہاء کی رائے:

۱-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا كان في ترك الأخذ ضرر ظاهر يلحقه في الدين أو النفس أو المال يباح له الأخذ" (بدائع الصنائع، جلد 7، صفحہ 41، مطبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

۲-شیخ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"المصلحة العامة تقدم على المفسدة الخاصة" (ردالمحتار، جلد 3، صفحہ 553، دار الفکر)

۳-قاضی زین الدین رحمہ اللہ نے فرمایا:

"إذا تعذر إقامة الأصل يصار إلى البدل المباح بقدر الحاجة" (الفتاوی الزینیۃ، صفحہ 456، المطبع العامریہ مصر)

خلاصہ ونتیجہ:

جہاں عوام الناس کو علاج کے لیے شدید مشکلات کا سامنا ہو اور کوئی دوسرا متبادل موجود نہ ہو، وہاں اضطراری طور پر ہیلتھ انشورنس کو اختیار کرنے کی اجازت ہوگی۔ تاہم، اسلامی نظام معیشت کے قیام اور تکافل جیسی حلال متبادل اسکیموں کو فروغ دینا ضروری ہے۔

کیا پچاس،سوافراد اجتماعی انشورنس کرا سکتے ہیں؟

سوال:(2)

ماہرین کے مطابق اگر انفرادی طور پر انشورنس کرانے کے بجائے پچاس سو افراد ایک ساتھ مل کر گروپ کی شکل میں انشورنس کرائیں تو کمپنیوں سے اپنی شرائط پر معاہدہ کر سکتے ہیں، اگر ایسا ہے تو کیا ایسے مبنی بر شرائط ہیلتھ انشورنس کو غرر وقمار سے خارج کر کے جواز کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ممکن ہے تو وہ شرائط کیا ہو سکتی ہیں؟

جواب:(2)

ہیلتھ انشورنس میں شرعی قباحت اور شرائط کے ذریعے اصلاح کی کوشش:

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر مالی معاہدہ شفاف، ظلم وزیادتی سے پاک، اور غیر یقینی (غرر) سے خالی ہونا چاہیے۔ انشورنس کے عام طریقہ کار میں غرر اور قمار

جیسے عناصر موجود ہوتے ہیں، جو اس کے عدم جواز کا سبب بنتے ہیں۔ اگر گروپ انشورنس میں ان قباحتوں کو دور کیا جا سکے اور معاملہ شریعت کے موافق بنایا جا سکے، تو یہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔

گروپ انشورنس میں شرائط کی ضرورت:

گروپ انشورنس میں اگر شرائط طے کرتے وقت اسلامی اصولوں کا لحاظ رکھا جائے، تو انشورنس کو ایک تعاونِ باہمی (mutual assistance) کی صورت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

۱- غرر اور قمار سے اجتناب:

معاہدہ واضح ہونا چاہیے اور اس میں غیر یقینی عناصر (uncertainty) کو ختم کیا جائے۔ مثلاً، معاہدے میں یہ طے کیا جائے کہ رقم صرف علاج کی ضروریات پر خرچ ہوگی اور اضافی رقم کسی قسم کے منافع کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔

۲- تعاونِ باہمی (تکافل) کی بنیاد پر معاہدہ:

تمام شریک افراد ایک مخصوص رقم جمع کریں، جو اجتماعی علاج کے اخراجات کے لیے استعمال ہو۔ اس رقم کا انتظام اور نگرانی شرعی بنیادوں پر ہو۔

۳- کمپنی کا کردار بطور منتظم:

انشورنس کمپنی کو محض ایک منتظم (administrator) کے طور پر رکھا جائے،

جو اس فنڈ کو شفاف طریقے سے استعمال کرے اور اس پر کوئی منافع نہ لے، سوائے جائز انتظامی اخراجات کے۔

۴-شرعی بنیادوں پر سرمایہ کاری:

جمع شدہ فنڈ کو اسلامی اصولوں کے مطابق حلال سرمایہ کاری میں لگایا جائے، تاکہ رقم محفوظ رہے اور فنڈ میں اضافہ ہو۔

دلائل فقہیہ کی روشنی میں:

۱-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الأصل فی المعاملات هو الجواز إلا إذا ورد دلیل یدل علی المنع" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 124، مطبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

یعنی معاملات میں اصل جواز ہے، جب تک کوئی صریح دلیل ممانعت کی نہ ہو۔

۲-علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے تعاون کے اصول کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وما کان من التعاون علی البر والخیر لا یمنع شرعاً" (الأشباہ والنظائر، صفحہ 85، دار الکتب العلمیۃ)

۳-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا انتفی الغرر والضرر فلا مانع من التصرف" (رد المحتار، جلد 4، صفحہ 487، دار الفکر)

گروپ انشورنس میں شرائط کی تفصیل:

ہر شریک کی جمع کردہ رقم کی تفصیلات اور استعمال واضح ہوں۔
رقم صرف شریک افراد کی طبی ضروریات کے لیے استعمال ہو۔
کسی قسم کا سودی یا حرام کاروبار نہ کیا جائے۔
انتظامیہ کی طرف سے شفافیت اور ایمانداری کی ضمانت ہو۔

خلاصہ ونتیجہ:

اگر گروپ انشورنس کو مذکورہ شرائط کے تحت اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جائے، تو اس میں موجود شرعی قباحتوں کو ختم کر کے جواز کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ نظام اسلامی تعاون اور تکافل کے اصول پر مبنی ہوگا اور علاج معالجے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک مباح حل فراہم کرے گا۔

اگر انشورنس کمپنی سال میں ایک مرتبہ چیک اپ ضرور کرائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: (3)

اگر انشورنس کمپنی سے یہ معاہدہ کیا جائے کہ سالانہ پریمیم جمع کرنے کی عوض میں کمپنی سال میں کم از کم ایک مرتبہ اپنے کسٹمر کا میڈیکل چیک اپ ضرور کرائے گی

خواہ اس کو مرض لاحق ہو یا نہ ہو، تو کیا اس قسط وار جمع شدہ رقم کو میڈیکل چیک اپ کی اجرت قرار دے کر شرعاً جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اور کیا یہ صورت غرر و قمار کے دائرے سے باہر ہوگی؟

جواب:(3)

انشورنس معاہدے میں سالانہ پریمیم کے عوض میڈیکل چیک اپ کا حکم:

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر عقد (معاہدہ) کے لیے ضروری ہے کہ وہ شفاف ہو، غیر یقینی (غرر) اور جوئے (قمار) سے پاک ہو، اور فریقین کے لیے مکمل طور پر واضح اور عادلانہ ہو۔ اگر انشورنس کمپنی کے ساتھ یہ معاہدہ کیا جائے کہ جمع شدہ رقم کے عوض سالانہ میڈیکل چیک اپ فراہم کیا جائے، تو اس صورت میں اس معاہدے کو اجارہ (کرائے پر خدمت حاصل کرنا) کی ایک صورت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

اجارہ کی شرطیں اور اس صورت کی تطبیق:

۱- معاوضہ معلوم ہو:

پریمیم کی صورت میں جو رقم ادا کی جا رہی ہے، وہ کمپنی کی طرف سے فراہم کردہ خدمت (میڈیکل چیک اپ) کے لیے اجرت قرار پائے گی۔

۲-خدمت واضح اور متعین ہو:

معاہدے میں میڈیکل چیک اپ کی نوعیت، وقت، اور جگہ واضح ہو، تا کہ غیر یقینی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

۳-اضافی شرائط کا اثر:

اگر کمپنی مزید سہولیات فراہم کرنے کی پابند ہو، جیسے مرض لاحق ہونے کی صورت میں علاج کے اخراجات اٹھانا، تو اس اضافی شرط کے تحت غرر یا قمار کے عناصر پیدا ہو سکتے ہیں۔

دلائل فقہیہ کی روشنی میں:

۱-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كل ما كان منتفعاً به جاز الاستئجار عليه" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 189، مطبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

یعنی ہر وہ چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے، اس پر اجارہ جائز ہے۔

۲-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ اجرت کے معاملے میں فرماتے ہیں:

"ينبغي أن يكون المعقود عليه معلوماً ليس فيه غرر" (رد المحتار، جلد 5، صفحہ 33، دار الفکر)

یعنی معاہدہ ایسی چیز پر ہو جو معلوم ہو اور اس میں غرر نہ ہو۔

۳-فقہاء نے اجارہ میں خدمات کو اجرت کی بنیاد پر قبول کیا ہے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں وضاحت ہے:

"الاجرة مقابل المنفعة، فإن كانت المنفعة معلومة جاز العقد"

(المبسوط، جلد 15، صفحہ 90، مطبع دار المعرفۃ)

اس معاہدے کی جائز شکل:

اگر سالانہ پریمیم کو میڈیکل چیک اپ کی اجرت قرار دیا جائے اور معاہدہ صرف اسی خدمت تک محدود رکھا جائے، تو یہ صورت غرر و قمار سے پاک ہو سکتی ہے۔
شرط یہ ہے کہ:

۱-میڈیکل چیک اپ کی خدمت معاہدے میں واضح ہو۔

۲-کمپنی اضافی فوائد، جیسے بیماری کی صورت میں علاج کے اخراجات کی ضمانت نہ دے۔

۳-جمع شدہ رقم صرف متعین خدمات کے لیے ہو اور اضافی امور میں استعمال نہ ہو۔

نتیجہ وخلاصہ:

اس مخصوص صورت میں، سالانہ پریمیم کو میڈیکل چیک اپ کی اجرت قرار دینا اور اسے اجارہ کی بنیاد پر انجام دینا شرعاً جائز ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں غرر اور قمار کا کوئی عنصر شامل نہ ہو۔ اگر معاہدے میں علاج کے اضافی اخراجات کی ضمانت شامل کی جائے، تو یہ معاہدہ دوبارہ غرر و قمار کے دائرے میں آ سکتا ہے اور جائز نہیں ہوگا۔

اجتماعی قربانی سے متعلق بعض تحقیق طلب مسائل

اجتماعی قربانی میں جانور اور حصے داروں کے حصہ کی تعیین کے بغیر قربانی کا حکم

سوال:1(الف)

کیا تمام حصے داروں کی طرف سے جانوروں کی تعیین کیے بغیر قربانی کرنا درست ہوگا؟اور قربانی ادا ہو جائے گی؟ یا یہ تعیین ضروری ہوگی کہ کون سا جانور کن حصے داروں کی طرف سے ہے؟

جواب:1(الف)

اجتماعی قربانی اور جانور کی تعیین کا مسئلہ

اجتماعی قربانی (یعنی ایک جانور میں کئی افراد کے حصے ہونا) فقہ حنفی میں جائز ہے، بشرطیکہ شرائطِ قربانی پوری ہوں۔اس سلسلے میں جانوروں کی تعیین اور حصے داروں کی وضاحت کے بارے میں درج ذیل نکات پیش ہیں:

۱- جانور کی تعیین کا حکم:

اجتماعی قربانی میں شرعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ ہر جانور کو پہلے سے کسی خاص حصے دار کے لیے معین کیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ قربانی کرتے وقت تمام حصے داروں کے حصے قربانی کے شرعی اصول کے مطابق ہوں اور تمام افراد کی نیت قربانی کی ہو۔

اگر قربانی کا مقصد شرعی طریقے سے پورا ہو جائے اور تمام افراد نیت کے لحاظ سے متفق ہوں، تو تعیین کے بغیر بھی قربانی درست ہوگی۔

البتہ اگر کسی حصے دار کی نیت قربانی کے علاوہ کچھ اور ہو (مثلاً گوشت حاصل کرنا)، تو یہ تمام حصے داروں کی قربانی کو باطل کر دے گا۔

فقہ حنفی کی دلیل:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولو اشترک سبعة فی بقرة أو بعیر ولم یعینوا السهام عند الذبح، جاز" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 326، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: اگر سات آدمی گائے یا اونٹ میں شریک ہوں اور ذبح کے وقت اپنے حصے معین نہ کریں، تو یہ جائز ہے۔

۲- شرعی اصول کی پابندی:

اجتماعی قربانی میں کامیابی کے لیے درج ذیل امور ضروری ہیں:

تمام حصے دار مسلمان ہوں اور قربانی کی نیت رکھتے ہوں۔

قربانی کرنے والا جانور شرعی طور پر قابل قربانی ہو (عمر، صحت وغیرہ کے لحاظ سے)۔

جانور کو ذبح کرتے وقت نیت قربانی کے لیے ہو، اور تمام حصے داروں کی طرف سے نیت کی تصدیق ہو۔

مزید وضاحت:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فأما الاشتراک فی الإبل والبقر، فیجوز أن یشترک سبعة من المسلمین، سواء کانوا أهل بیت واحد أو أهل بیوت شتی، ویکون ذلک عن کل واحد منهم أضحیة إذا کان کل واحد منهم ممن تجب علیه الأضحیة أو یرید بها التقرب" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 72، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: اونٹ اور گائے میں سات مسلمان شریک ہو سکتے ہیں، چاہے وہ ایک گھر کے ہوں یا الگ الگ گھروں کے۔ یہ ہر ایک کی طرف سے قربانی شمار ہوگی، بشرطیکہ وہ قربانی واجب ہونے والے ہوں یا قربانی سے تقرب حاصل کرنے کی نیت رکھتے ہوں۔

۳- تعیین کے بغیر قربانی کے درست ہونے کی شرائط:

تعیین کے بغیر اجتماعی قربانی اس وقت درست ہوگی جب:

۱- ہر حصے دار کی نیت قربانی کی ہو۔

۲-جانور کے سات حصے پورے ہوں، اور کسی حصے دار کا حصہ قربانی کے علاوہ کسی اور نیت سے نہ ہو۔

۳-حصے داروں کی طرف سے کوئی ایسا عمل نہ ہو جو شرعی اصول کو باطل کرے، مثلاً کسی کی نیت گوشت یا تجارت کی ہو۔

فقہ کی وضاحت:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولا يجوز الاشتراك في الأضحية إذا كان بعضهم غير متقرب" (الہدایہ، جلد 4، صفحہ 71، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: قربانی میں اشتراک اس وقت جائز نہیں جب بعض افراد قربانی سے تقرب کی نیت نہ رکھتے ہوں۔

۴-جانور اور حصے کی تعیین کی عدمِ شرطیت:

فقہ حنفی میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ اجتماعی قربانی کے لیے جانور یا حصے کی تعیین ذبح سے پہلے ضروری نہیں، بشرطیکہ نیت قربانی کی ہو اور شرائط پوری ہوں۔

"لا يشترط تعيين السهم عند الاشتراك في الأضحية، بل يكفي أن يكون كل واحد من الشركاء قاصداً التقرب" (فتح القدیر، جلد 9، صفحہ 534، مطبع دار الفکر، بیروت)

یعنی: قربانی میں شرکت کے وقت حصے کی تعیین شرط نہیں، بلکہ یہ کافی ہے کہ ہر شریک قربانی کی نیت رکھتا ہو۔

نتیجہ:

۱-اجتماعی قربانی میں جانوروں کی تعیین ذبح سے پہلے ضروری نہیں۔

۲-یہ ضروری ہے کہ تمام حصے دار قربانی کی نیت رکھتے ہوں اور کوئی بھی شریک اس نیت سے شامل نہ ہو جو شرعی طور پر قربانی کے مقصد سے متصادم ہو۔

۳-اگر حصے داروں کی نیت قربانی کی ہے اور شرائط پوری ہیں، تو قربانی ادا ہو جائے گی، خواہ جانور کی تعیین نہ کی گئی ہو۔

۴-لیکن بہتر یہ ہے کہ انتظامی معاملات میں آسانی کے لیے ہر جانور کے حصے داروں کی وضاحت کی جائے، تاکہ کسی قسم کے شک وشبہ کا اندیشہ نہ ہو۔

اجتماعی قربانی میں مخلوط گوشت سے حصہ داروں کو دینے کا حکم

سوال: 1 (ب)

گوشت کو آپس میں ملا لینا اور اس مخلوط گوشت میں سے اندازے سے حصے داروں کو گوشت دینا کیا شرعاً درست ہوگا؟ یا ہر ایک جانور کے گوشت کو الگ الگ رکھنا اور حصے داروں کو اسی میں سے دینا ضروری ہوگا؟

جواب:1(ب)

اجتماعی قربانی میں گوشت کے اختلاط کا حکم:

اجتماعی قربانی میں گوشت کو آپس میں ملانا اور پھر اس مخلوط گوشت کو حصے داروں میں تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ تقسیم کے وقت ہر حصے دار کو اس کے حصے کے مطابق پورا گوشت دیا جائے۔ گوشت کے اختلاط کے بعد اندازے سے تقسیم کرنا اس وقت تک درست ہوگا جب یہ تقسیم انصاف اور برابری کے اصولوں پر مبنی ہو، اور کسی حصے دار کو کم یا زیادہ نہ دیا جائے۔

ا- گوشت کے اختلاط کا جواز:

فقہ حنفی میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ اجتماعی قربانی کے جانوروں کا گوشت آپس میں ملایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ:

ا- ہر حصے دار کو اس کا پورا حصہ دیا جائے۔

۲- اختلاط کے بعد تقسیم میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو۔

فقہ حنفی کی دلیل:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فإن اختلط اللحم بعد القسمة، أو قبله بشرط أن يعطى كل واحد حصته، لا بأس به" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 326، مطبع دار إحياء التراث العربي، بیروت)

یعنی: اگر گوشت کو تقسیم کے بعد یا اس سے پہلے ملا دیا جائے، بشرطیکہ ہر شخص کو اس کا حصہ دیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲- ہر جانور کے گوشت کو الگ رکھنا ضروری نہیں:

یہ ضروری نہیں کہ ہر جانور کے گوشت کو الگ الگ رکھا جائے اور حصے داروں کو اسی میں سے دیا جائے۔ البتہ اگر انتظامی معاملات میں آسانی اور شکوک وشبہات سے بچنے کے لیے ایسا کیا جائے تو بہتر ہے۔

اصل شرط یہ ہے کہ ہر حصے دار کو اس کا شرعی حصہ انصاف کے ساتھ مل جائے۔

گوشت کے ملا دینے میں آسانی اور سہولت ہے، بشرطیکہ کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا اختلط اللحم فيجوز قسمته كيلاً أو وزناً، لأن المقصود حصول التساوی بينهم" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 81، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: اگر گوشت کو ملا دیا جائے تو اس کی تقسیم پیمائش یا وزن کے ذریعے جائز ہے، کیونکہ اصل مقصد حصے داروں کے درمیان مساوات پیدا کرنا ہے۔

۳- اندازے سے تقسیم کا حکم:

اگر گوشت کو ملا کر اندازے سے تقسیم کیا جائے اور یہ اندازہ شرعی حصہ کے قریب ہو، تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ کسی کو کم یا زیادہ نہ دیا جائے۔

بہتر یہی ہے کہ تقسیم وزن یا پیمائش کے ذریعے کی جائے تا کہ کسی قسم کے تنازع کا اندیشہ نہ رہے۔

فقہ حنفی کی وضاحت:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإن كانوا سبعة شركاء في البقرة أو البدنة، فيقسم اللحم بينهم وزناً أو كيلاً، ليحصل التساوي، ولا يجوز بغير ذلك" (الہدایہ، جلد 4، صفحہ 72، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: اگر سات شرکاء گائے یا اونٹ میں شریک ہوں، تو گوشت کو وزن یا پیمائش کے ذریعے تقسیم کیا جائے تا کہ مساوات ہو، اور بغیر اس کے تقسیم جائز نہیں۔

۴۔ تقسیم میں عدل کی اہمیت:

اجتماعی قربانی کے گوشت کی تقسیم میں عدل وانصاف کو یقینی بنانا واجب ہے۔ اگر گوشت کو ملا کر تقسیم کرنے میں کسی قسم کی کمی بیشی ہو جائے، تو یہ شرعی اصول کے خلاف ہوگا اور تمام حصے داروں کی قربانی متاثر ہوسکتی ہے۔

حدیث مبارکہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من غش فليس منا" (صحیح مسلم، حدیث نمبر 101)

یعنی: جودھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں۔

یہ حدیث اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ تقسیم میں دھوکہ دہی یا کمی بیشی کسی بھی حالت میں جائز نہیں۔

۵-اختلاط کے بعد تقسیم کے طریقے کی رعایت:

اختلاط کے بعد گوشت کی تقسیم کو وزن یا پیمائش کے ذریعے کرنا افضل اور مستحب ہے، تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔ اگر اندازے سے تقسیم کی جائے، تو لازم ہے کہ ہر حصے دار کو اس کا مکمل حصہ ملے۔

فقہ حنفی کی مزید وضاحت:

"ویجب التساوي فی الأجزاء، ویکره الظلم فی القسمة" (فتح القدیر، جلد 9، صفحہ 537، مطبع دار الفکر، بیروت)

یعنی: حصوں میں مساوات واجب ہے، اور تقسیم میں ظلم مکروہ ہے۔

نتیجہ:

۱-اجتماعی قربانی میں گوشت کو آپس میں ملا کر تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ ہر حصے دار کو اس کا حصہ پورا دیا جائے۔

۲-ہر جانور کے گوشت کو الگ رکھنا ضروری نہیں، لیکن بہتر انتظام کے لیے ایسا کرنا مستحب ہے۔

۳-تقسیم وزن یا پیمائش کے ذریعے ہونی چاہیے تا کہ کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو۔
۴-اگر اندازے سے تقسیم کی جائے، تو لازم ہے کہ یہ اندازہ عدل وانصاف پر مبنی ہو۔

اجتماعی قربانی میں اگر کوئی جانور مر جائے تو اس کی بھرپائی کیسے ہوگی؟

سوال:1(ج)

حصوں کی تعداد کے اعتبار سے جانوروں کی خریداری کے بعد اگر بالفرض کوئی جانور مر گیا تو یہ مہلوک جانور کن سات لوگوں کی طرف سے سمجھا جائے گا؟ اور اس کی قیمت کون ادا کرے گا؟ اسی طرح اگر قربانی سے پہلے کوئی جانور عیب دار ہو جائے اور قربانی کے لائق نہ رہے تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب:1(ج)

اجتماعی قربانی میں جانور کے مرنے یا عیب دار ہونے کا حکم:

اجتماعی قربانی میں اگر جانور خریدنے کے بعد قربانی سے پہلے مر جائے یا عیب دار ہو جائے اور قربانی کے لائق نہ رہے، تو اس کے متعلق فقہ حنفی میں درج ذیل اصولوں کی روشنی میں تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

۱-مہلوک جانور کن لوگوں کی طرف سے سمجھا جائے گا؟

اجتماعی قربانی کے لیے جو جانور خریدا گیا تھا، وہ سات حصے داروں کی ملکیت مشترکہ ہوتی ہے۔ اگر جانور قربانی سے پہلے مر جائے تو یہ نقصان تمام حصے داروں پر مساوی تقسیم ہوگا، یعنی ہر ایک کے حصے میں برابر نقصان شمار کیا جائے گا۔

فقہ کی دلیل:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فإن هلك المال المشترك كان هلاكه على قدر السهام"

(ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 209، مطبع دار إحياء التراث العربي، بیروت)

یعنی: اگر مشترکہ مال ہلاک ہو جائے تو اس کا نقصان حصے داروں کے حصوں کے مطابق ہوگا۔

وضاحت:

اگر جانور سات افراد کی طرف سے تھا اور وہ مر گیا، تو ہر شریک اپنے حصے کے مطابق نقصان اٹھائے گا۔

۲-مہلوک جانور کی قیمت کون ادا کرے گا؟

مہلوک جانور کی قیمت یا نقصان کا بوجھ تمام حصے داروں پر برابر تقسیم ہوگا،

کیونکہ یہ جانوران کی مشترکہ ملکیت تھا۔

اگر تمام حصے دار نیا جانور خریدنے پر راضی ہوں، تو وہ نئی خریداری میں حصہ ڈالیں گے۔

اگر کوئی شریک نیا حصہ نہیں لینا چاہتا، تو وہ اپنی قربانی کا انتظام خود کرے گا۔

۳-اگر جانور عیب دار ہو جائے:

اگر جانور قربانی سے پہلے کسی عیب کی وجہ سے قربانی کے لائق نہ رہے (مثلاً اندھا ہو جانا، کان یا دُم کا کٹ جانا وغیرہ)، تو اس صورت میں درج ذیل حکم ہوگا:

۱-جانور کو تبدیل کرنا واجب ہوگا:

چونکہ یہ جانور قربانی کے لیے خریدا گیا تھا اور قربانی واجب ہے، اس لیے ایسا جانور تبدیل کرنا لازم ہوگا جو قربانی کے شرائط پر پورا اترے۔

فقہ کی دلیل:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإن عابت البدنة أو البقرة أو الشاة بعد ما عينها للذبح، يلزم تغييرها إذا كانت من الواجبات" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 70، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: اگر قربانی کے لیے اونٹ، گائے یا بکری متعین کرنے کے بعد وہ عیب دار ہو جائے، تو اسے تبدیل کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ قربانی واجب ہو۔

۲-خرچہ کس پر ہوگا؟

جانور تبدیل کرنے کا خرچ تمام حصے داروں پر برابر تقسیم ہوگا، کیونکہ وہ سب مشترکہ طور پر اس کے مالک ہیں۔

۴-دیگر مسائل:

اگر جانور خریدنے کے وقت کسی عیب کا علم نہ تھا اور خریداری کے بعد وہ عیب دار ہوجائے، تو اس کی ذمہ داری بھی مشترکہ ہوگی۔

اگر عیب دار جانور کی قیمت میں کمی واقع ہو، تو اس کی قیمت نکال کر باقی رقم نئی قربانی میں استعمال ہوگی۔

فقہ کی دلیل:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إن هلك أو تعيب في يده، يرجع على الشركاء بحسب حصصهم" (الہدایہ، جلد 4، صفحہ 71، مطبع دار إحياء التراث العربي، بیروت)

یعنی: اگر جانور مالک کی ملکیت میں ہلاک ہوجائے یا عیب دار ہوجائے، تو شرکاء پر ان کے حصوں کے مطابق ذمہ داری آئے گی۔

۵-نیا جانور خریدنا:

اگر مہلوک یا عیب دار جانور کی جگہ نیا جانور خریدا جائے تو وہ بھی تمام شرکاء

کے حصوں کے مطابق ہوگا۔

نیا جانور خریدنے کے بعد اس کی قربانی کرنا شرعی طور پر واجب ہوگا۔

نتیجہ:

۱-اگر اجتماعی قربانی کا جانور مر جائے، تو نقصان تمام حصے داروں پر برابر تقسیم ہوگا۔

۲-اگر جانور قربانی سے پہلے عیب دار ہو جائے، تو اسے تبدیل کرنا لازم ہوگا اور خرچ تمام شرکاء پر برابر ہوگا۔

۳-مہلوک یا عیب دار جانور کی جگہ نیا جانور خریدا جائے گا، اور اس کی قیمت بھی سب شرکاء پر مساوی تقسیم ہوگی۔

اجتماعی قربانی میں اگر کوئی جانور عیب دار ہو جائے تو اس کی بھرپائی کیسے ہوگی؟

سوال:1(د)

حصوں کی تعداد کے اعتبار سے مثلا 100 جانوروں کی خریداری کے بعد اگر بالفرض کوئی جانور مر گیا لیکن یہ معلوم نہیں مرنے والا جانور کس کا تھا چوں کہ خریداری مشترکہ بغیر نام کی تعیین کے کی گئی تھی تو یہ مہلوک جانور کن سات لوگوں کی طرف سے

سمجھا جائے گا؟ اور نام کی تعیین کی صورت کیا ہوگی؟ اور اس کی قیمت کون ادا کرے گا؟ اسی طرح اگر قربانی سے پہلے کوئی جانور عیب دار ہو جائے اور قربانی کے لائق نہ رہے تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب: 1(د)

اجتماعی قربانی کے جانور کے مرنے یا عیب دار ہونے کی تفصیلات:

ا-مشترکہ خریداری اور جانور کے مرنے کا مسئلہ:

اگر اجتماعی قربانی کے لیے سو((100 جانور خریدے گئے اور ان کی خریداری مشترکہ طور پر بغیر نام کی تعیین کے کی گئی ہو، تو جانور کے مرنے کی صورت میں درج ذیل اصول لاگو ہوں گے:

ا-مہلوک جانور کس کے حصے میں شمار ہوگا؟

چونکہ خریداری مشترکہ اور نام کی تعیین کے بغیر کی گئی تھی، اس لیے مہلوک جانور کا نقصان تمام شرکاء پر مساوی تقسیم ہوگا۔ یعنی مرنے والا جانور ان سات شرکاء کی طرف سے شمار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس نقصان کو تمام حصے داروں پر تقسیم کیا جائے گا۔

فقہ کی دلیل:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إذا اشترک جماعة فی شراء حیوان أو أی مال، ثم هلک، فإن

الهلاک یرجع علی الشرکاء کلهم بحسب حصصهم" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 65، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: اگر چند افراد نے کسی حیوان یا مال کو مشترکہ طور پر خریدا اور وہ ہلاک ہو گیا، تو اس کا نقصان تمام شرکاء پر ان کے حصے کے مطابق ہوگا۔

۲- قیمت کی ادائیگی کا طریقہ:

مہلوک جانور کی قیمت تمام شرکاء پر ان کے حصے کے مطابق تقسیم ہوگی۔

اگر ہر شریک پہلے ہی اپنی رقم جمع کرا چکا ہے تو اس نقصان کو اجتماعی رقم سے پورا کیا جائے گا۔

اگر کوئی اضافی رقم درکار ہو تو تمام شرکاء برابر طور پر ادا کریں گے۔

فقہ کی وضاحت:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"**وإن هلک شيء مشترک، فإن الهلاک یوزع علی الشرکاء بحسب سهامهم**" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 210، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت)

۳- نام کی تعیین کی صورت میں حکم:

اگر خریداری کے وقت شرکاء کے نام معین کیے گئے ہوں (مثلاً ہر جانور کے ساتھ اس کے حصے داروں کا تعین کیا گیا ہو)، تو مہلوک جانور انہی سات شرکاء کی

طرف سے شمار ہوگا جن کے نام اس جانور کے ساتھ معین تھے۔

ایسی صورت میں ان سات شرکاء پر لازم ہوگا کہ وہ نیا جانور خرید کر قربانی کریں، یا متبادل انتظام کریں۔

۴- جانور کے عیب دار ہونے کا مسئلہ:

اگر قربانی سے پہلے کوئی جانور عیب دار ہو جائے اور قربانی کے لائق نہ رہے، تو اس کے متعلق درج ذیل احکام ہیں:

۱- نیا جانور خریدنا واجب ہوگا:

چونکہ عیب دار جانور قربانی کے لیے موزوں نہیں ہے، اس لیے اسے تبدیل کرنا لازم ہوگا۔

اگر عیب جانور کے خریدنے کے بعد آیا ہو تو اس کی قیمت اور تبدیلی کا خرچ تمام شرکاء پر مساوی ہوگا۔

اگر عیب خریداری سے پہلے تھا اور معلوم نہ ہو سکا، تو نقصان اجتماعی فنڈ سے پورا کیا جائے گا۔

فقہ کی دلیل:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإن تعيب الحيوان بعد تعيينه، يلزم استبداله إذا كان من

الواجبات" (الہدایہ، جلد 4، صفحہ 73، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

۴-عیب دار جانور کا کیا ہوگا؟

عیب دار جانور کو بیچ کر اس کی قیمت نیا جانور خریدنے کے لیے استعمال کی جائے گی۔ اگر اضافی رقم کی ضرورت ہو تو تمام شرکاء برابر حصہ ڈالیں گے۔

۵-نقصان کی تقسیم کا عمومی اصول:

اجتماعی قربانی کے معاملات میں نقصان (خواہ جانور کے مرنے کی صورت میں ہو یا عیب دار ہونے کی صورت میں) سب شرکاء پر مساوی تقسیم ہوگا، کیونکہ ان کی شراکت مشترکہ ہے اور کسی مخصوص جانور کے ساتھ ان کا تعلق معین نہیں کیا گیا تھا۔

فقہ کی وضاحت:

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا كان المال مشتركاً، فالخسارة مشتركة بينهم بحسب حصصهم" (البحر الرائق، جلد 5، صفحہ 289، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

نتیجہ:

۱-اگر جانور مر جائے اور اس کے شرکاء معلوم نہ ہوں، تو اس کا نقصان تمام شرکاء پر مساوی تقسیم ہوگا۔

۲-نام کی تعیین کی صورت میں مہلوک جانور انہی سات شرکاء کا شمار ہوگا جن کے نام پہلے معین تھے، اور نقصان انہی پر ہوگا۔

۳-عیب دار جانور کو تبدیل کرنا واجب ہے، اور اس کی قیمت تمام شرکاء پر تقسیم ہوگی۔

۴-عیب دار جانور کی فروخت سے حاصل رقم نیا جانور خریدنے میں استعمال ہوگی۔

اجتماعی قربانی میں نام اور حصہ کی تعیین ذبح کے بعد کرنے کا حکم

سوال:1(ھ)

100 جانور مشترکہ قربانی کے لئے خریدا اور ذبح سے پہلے نام کی تعیین نہ کی گئی ہو؛ بلکہ ذبح کرنے کے بعد ناموں کی تعیین کی جائے تو متعینہ حصے داروں کی طرف سے قربانی ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب:1(ھ)

اجتماعی قربانی میں ذبح کے بعد ناموں کی تعیین کا مسئلہ:

اگر اجتماعی قربانی کے لیے 100 جانور خریدے گئے ہوں اور قربانی سے پہلے کسی جانور کے ساتھ کسی حصے دار کے نام کی تعیین نہ کی گئی ہو، بلکہ ذبح کے بعد

ناموں کی تعیین کی جائے تو شرعی طور پر اس صورت میں قربانی درست نہیں ہوگی۔

فقہ حنفی کی روشنی میں اصول:

فقہ حنفی میں قربانی کے جانور اور اس کے شرکاء کی تعیین ذبح سے پہلے ضروری ہے۔ ہر حصے دار کا حصہ کسی متعین جانور میں ہونا چاہیے تا کہ ہر شریک کے حق کا تعین ہو سکے۔ اگر ذبح سے پہلے یہ تعیین نہیں کی گئی اور ذبح کے بعد نام معین کیے گئے، تو یہ شرعاً معتبر نہیں ہوگا اور کسی شریک کی قربانی ادا نہیں ہوگی۔

۱-شرعی دلیل: نام کی تعیین ذبح سے پہلے ضروری ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لابد من تعيين السبع قبل الذبح؛ لأن الذبح قربة، ولا تتحقق القربة إلا بالتعيين" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 210، مطبع دار إحياء التراث العربي، بيروت)

یعنی: ذبح سے پہلے ساتوں حصہ کی تعیین ضروری ہے، کیونکہ ذبح ایک عبادت ہے اور عبادت کا تحقق تعیین کے بغیر ممکن نہیں۔

وضاحت:

قربانی عبادت ہے، اور عبادت کے لیے نیت اور تعیین لازم ہے۔ اگر کسی جانور کے حصے دار ذبح سے پہلے معین نہ ہوں تو اس جانور کی قربانی کسی شریک کی طرف سے قبول نہیں ہوگی، کیونکہ عبادت میں نیت اور تعیین شرط ہے۔

۲-ذبح کے بعد تعیین کیوں کافی نہیں؟

ذبح کے بعد جانور کے گوشت کو تقسیم کرنے کے وقت شرکاء کے نام معین کرنا قربانی کے مقصود (قربت) کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ اس وقت ذبح ایک عبادت کے بجائے محض ایک عمل بن جاتا ہے۔

فقہ کی وضاحت:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والعبادة لا تصح إلا بالنية، ولا تصح النية إلا بتعيين القربة قبل أداء الفعل" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 72، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: عبادت بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوتی، اور نیت اس وقت تک درست نہیں جب تک قربانی کی نیت فعل (ذبح) سے پہلے نہ کی جائے۔

۳-مشترکہ قربانی میں تعیین کی اہمیت:

مشترکہ قربانی میں سات افراد کے حصے داروں کی تعیین ذبح سے پہلے ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون سا جانور کس کے حصے کے لیے ذبح ہو رہا ہے۔

فقہی قاعدہ:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فإن لم يعينوا السبع قبل الذبح لم يصح عنهم" (الہدایہ، جلد 4، صفحہ 71،

مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: اگر ذبح سے پہلے ساتوں حصے کی تعیین نہ کی گئی ہو تو قربانی ان کی طرف سے صحیح نہیں ہوگی۔

۴- ذبح کے بعد گوشت کی تقسیم سے قربانی کا تحقق نہیں ہوتا:

ذبح کے بعد گوشت کو سات حصوں میں تقسیم کر کے ان حصے داروں کے نام معین کرنا شریعت میں قربانی کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا، کیونکہ قربانی عبادت ہے اور عبادت کی نیت اور تعیین پہلے ہونی چاہیے۔

فقہ حنفی کی وضاحت:

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الذبح عبادة مالية، فلا بد فيها من تعيين المالكية قبل فعل الذبح" (فتح القدیر، جلد 8، صفحہ 78، مطبع دار الفکر، بیروت)

یعنی: ذبح ایک مالی عبادت ہے، اس میں ذبح سے پہلے مالکیت کی تعیین ضروری ہے۔

۵- نتیجہ:

۱- ذبح سے پہلے کسی جانور میں حصے داروں کے نام معین کرنا شرعاً لازم ہے۔

۲- اگر 100 جانور خریدے گئے ہوں اور ذبح سے پہلے کسی جانور کے حصے دار معین نہ کیے گئے ہوں، تو قربانی درست نہیں ہوگی۔

3- ذبح کے بعد گوشت کی تقسیم کے وقت نام معین کرنا قربانی کے شرعی تقاضے کو پورا نہیں کرتا اور کسی شریک کی قربانی ادا نہیں ہوگی۔

تنبیہ: اجتماعی قربانی کے منتظمین پر لازم ہے کہ ذبح سے پہلے ہر جانور کے ساتھ اس کے شرکاء کے نام معین کریں تاکہ قربانی کے شرعی تقاضے پورے ہوں۔

اجتماعی قربانی میں نام کی تعیین کے بعد نام تبدیل کرنے کا حکم

سوال:2(الف)

اگر منتظمین نے جانور خریدتے وقت حصے داروں کے ناموں کی تعیین کر دی تھی، تو کیا بعد میں ناموں کے اندر وہ تبدیلی کر سکتے ہیں؟

جواب:2(الف)

جانور کی قربانی کے معاملے میں اگر منتظمین نے جانور خریدتے وقت ہر حصہ دار کے نام کی تعیین کر دی ہو، تو ان ناموں میں تبدیلی کے جواز یا عدمِ جواز کا مسئلہ شریعت اور فقہ حنفی کی روشنی میں دو بنیادوں پر منحصر ہے: نیت اور مالکانہ تصرف۔

فقہ حنفی کا اصول:

فقہ حنفی کے مطابق قربانی کے جانور کے ہر حصے کا مالک اپنا حصہ اسی نیت کے ساتھ ادا کرے گا جس نیت سے حصہ خریدا گیا ہو۔ اگر نیت میں تبدیلی یا حصہ داروں

کے بدلنے سے وہ شرعی تقاضے پورے نہ ہوں، تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

۱- جانور خریدتے وقت تعیین کی حیثیت:

اگر جانور خریدتے وقت ہر حصے دار کا نام متعین کرلیا گیا اور اس نام کے ساتھ نیت بھی کرلی گئی، تو اب اس میں تبدیلی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مالکانہ تصرف میں خلل پیدا کرسکتا ہے اور نیت کا تبدیل ہونا بھی قربانی کی قبولیت پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔

۲- حصے داروں کا اتفاق:

اگر تمام حصے دار باہمی رضامندی کے ساتھ ناموں کی تبدیلی پر متفق ہوں، اور ہر نیا حصہ دار قربانی کے تقاضوں کو پورا کرے، تو تبدیلی کی گنجائش ہے، بشرطیکہ شرعی شرائط مکمل ہوں۔

معتبر فقہی عبارات:

۱- فتاویٰ عالمگیری:

"وإذا اشترى الشاة أضحية عن نفسه وأخرى عن غيره ينوى عند الذبح، فلا يجوز أن يغير نية الشريک بعد التعيين" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 302، مطبع دارالفکر بیروت)

۲- بدائع الصنائع:

"ولو كان الشركاء قد عيّنوا أسمائهم عند شراء البهيمة، لم يكن

لهم أن يغيروا التعيين إلا برضا الجميع" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 207، مطبع دارالکتب العلمیۃ)

۳-الدرالمختار:

"ولا يجوز تغيير النية أو المالک بعد التعيين إلا فی حالة الضرورة وبشرط عدم التلاعب بالشرائط الشرعية" (الدر المختار، جلد 6، صفحہ 326، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

خلاصہ:

اگر حصے داروں کے نام جانور خریدتے وقت متعین کر لیے گئے ہیں، تو ان ناموں میں تبدیلی بغیر تمام حصے داروں کی رضامندی اور شرعی شرائط کے مکمل ہونے کے جائز نہیں۔ لیکن اگر یہ شرائط پوری ہوں اور کوئی تلاعب نہ ہو، تو تبدیلی کی گنجائش موجود ہے۔

اجتماعی قربانی میں منتظمین کو تعیین کے بعد نام تبدیل کرنے کا اختیار ہوگا یا نہیں؟

سوال: 2(ب)

اگر اجتماعی قربانی کا مشترکہ جانور خریدتے وقت تو نام کی تعیین نہیں کی تھی؛ لیکن بعد میں تعیین کر دی گئی، تو کیا اب منتظمین کو جنکی حیثیت قربانی کرنے والے کے

وکیل کی ہے؛ کسی وجہ سے ان ناموں میں تبدیلی کا اختیار ہوگا یا نہیں؟

جواب:2(ب)

اجتماعی قربانی کے معاملے میں اگر مشترکہ جانور خریدتے وقت حصہ داروں کے نام کی تعیین نہیں کی گئی تھی، لیکن بعد میں تعیین کر دی گئی، تو شرعی طور پر یہ مسئلہ وکیل اور موکل کے تعلقات اور نیت کے احکام سے متعلق ہوگا۔ منتظمین چونکہ حصہ داروں کے وکیل ہیں، اس لیے ان کے اختیارات شریعت کی حدود اور حصہ داروں کی ہدایات کے مطابق ہوں گے۔

فقہ حنفی کا اصول:

فقہ حنفی میں وکالت کا اصول یہ ہے کہ وکیل اپنے موکل کی اجازت کے بغیر وہی عمل انجام دے سکتا ہے جو شریعت کے دائرے میں اور نیت کے مطابق ہو۔ اگر وکیل (منتظمین) نے کسی وجہ سے حصے داروں کے نام میں تبدیلی کرنا ہو، تو اس کے لیے شرعی اجازت اور موکلین کی رضامندی ضروری ہے۔

۱۔ تعیین کے بغیر جانور کی خریداری:

اگر جانور خریدتے وقت حصے داروں کے نام متعین نہیں کیے گئے تھے، تو یہ شرعی طور پر درست ہے، کیونکہ اس وقت نیتِ قربانی کا عمومی مقصد ہی کافی ہے۔ اس کے بعد اگر حصے داروں کے نام متعین کر دیے جائیں، تو وہ نام شریعت کی نظر میں معتبر

ہو جاتے ہیں۔

۲-تبدیلی کا جواز:

اگر بعد میں کسی مصلحت کے تحت حصے داروں کے ناموں میں تبدیلی ضروری ہو، تو منتظمین کو یہ تبدیلی صرف اس وقت کرنے کی اجازت ہوگی:

جب تمام حصہ دار اس تبدیلی پر رضامند ہوں۔

اور یہ تبدیلی کسی شرعی خرابی یا دھوکہ دہی کا باعث نہ ہو۔

وکیل (منتظم) کو اس تبدیلی میں شرعی حدود کی پابندی کرنی ہوگی۔

معتبر فقہی عبارات:

۱-فتاویٰ عالمگیری:

"إذا كان الوكيل قد عين الأسماء بأمر الموكلين، فلا يجوز له أن يغيرها إلا بإذنهم" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 301، مطبع دار الفکر بیروت)

۲-ردالمحتار:

"التعيين بعد الشراء جائز إذا كان الموكل قد فوض ذلك إلى الوكيل، ولا يجوز تغييره إلا إذا كان ذلك لصالح الجميع" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 324، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

۳-البحر الرائق:

"إذا لم يتم التعيين عند الشراء، فلا مانع من التعيين بعده، بشرط

أن يكون بالتراضي بين الأطراف" (البحر الرائق، جلد 7، صفحہ 242، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

خلاصہ:

اگر جانور خریدتے وقت نام متعین نہیں کیے گئے اور بعد میں تعیین کر دی گئی، تو یہ جائز ہے، لیکن منتظمین (وکیل) کو بغیر تمام حصے داروں کی رضامندی کے ان ناموں میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ یہ تبدیلی کسی مصلحتِ شرعیہ کے تحت ہو اور تمام شرائط پوری کی جائیں۔

اجتماعی قربانی کے بعد بچی ہوئی رقم کا حکم

سوال: (3)

اجتماعی قربانی میں اگر رقم بچ جائے، اور اصل مالک کو واپس کرنا یا اس سے اجازت لینا مشکل ہو تو اس رقم کا کیا حکم ہوگا؟ کیا وہ رقم منتظمین اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں؟

جواب: (3)

اجتماعی قربانی میں اگر حصے داروں کی طرف سے جمع شدہ رقم میں سے کچھ رقم بچ جائے، تو اس کا حکم شریعت کی روشنی میں حصہ داروں کے حقوق اور امانت کے اصول پر مبنی ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق، یہ رقم حصہ داروں کی امانت شمار ہوگی اور منتظمین

کے لیے اس کا ذاتی یا دیگر غیر متعلقہ استعمال جائز نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ تمام حصہ داروں سے اجازت نہ لے لیں۔

فقہ حنفی کے اصول:

ا-بچی ہوئی رقم امانت ہے:

منتظمین کو جمع شدہ رقم پر صرف امانت دار کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اس رقم کے مالک نہیں ہیں اور اس میں تصرف کرنے کا حق صرف مالک (حصے دار) کو ہے۔ اگر بچی ہوئی رقم واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو شرعی اصولوں کے تحت دیگر متبادل راستے اختیار کرنے ہوں گے۔

۲-حصہ داروں کی اجازت:

اگر تمام حصہ داروں سے اجازت لینا مشکل ہو، تو منتظمین کو یہ رقم ایسے امور میں خرچ کرنی چاہیے جو عام لوگوں کے فائدے یا دینی مقاصد کے لیے ہوں، جیسے کسی فلاحی کام یا مسجد وغیرہ میں دینا۔

۳-ذاتی استعمال ناجائز ہے:

منتظمین کے لیے بچی ہوئی رقم کو ذاتی استعمال میں لانا ناجائز ہے، کیونکہ یہ خیانت کے زمرے میں آئے گا، جیسا کہ قرآن وحدیث میں خیانت کی سخت

ممانعت ہے۔

فقہی عبارات:

۱-فتاویٰ عالمگیری:

"لو بقي من المال شيء بعد استيفاء الحقوق، فإن كان مالًا أمانة لايجوز التصرف فيه إلا بإذن المالك" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 336، مطبع دارالفکر بیروت)

۲- الدرالمختار:

"والأصل أن الوكيل أو الأمين إذا بقي في يده شيء بعد قضاء الغرض، فإنه يرده إلى صاحبه أو يستأذن منه في التصرف" (الدرالمختار، جلد 6، صفحہ 417، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

۳-البحرالرائق:

"كل مال لم يتصرف فيه بإذن المالك يعد أمانةً، ولا يجوز استعماله في مصالحه الخاصة" (البحرالرائق، جلد 7، صفحہ 119، مطبع دارالکتب العلمیۃ)

حل:

۱-اگرممکن ہوتو،رقم کواصل مالک تک پہنچانے کی ہرممکن کوشش کی جائے۔

۲-اگر مالکوں سے اجازت لینا یارقم واپس کرنا ناممکن ہو،تو منتظمین کو یہ رقم کسی دینی اورفلاحی مقصد میں استعمال کرنی چاہیے،جیسے:

کسی مسجد کی تعمیر ومرمت۔

غریبوں کی مدد۔

کسی تعلیمی ادارے یا فلاحی کام میں خرچ کرنا۔

۳۔منتظمین کے لیے اس رقم کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا ہرگز جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ امانت میں خیانت شمار ہوگی۔

خلاصہ:

اجتماعی قربانی میں بچ جانے والی رقم حصہ داروں کی امانت ہے۔اگر اسے واپس کرنا یا ان سے اجازت لینا ممکن نہ ہو، تو یہ رقم فلاحی اور دینی مقاصد میں خرچ کی جائے، لیکن ذاتی استعمال ہرگز جائز نہیں۔

اجتماعی قربانی کے لئے حصے وصول کرنے والے کے لئے انعام کا حکم

سوال:(4)

اجتماعی قربانی کے حصے وصول کرنے والے محصلین کو منتظمین کی طرف سے فی حصہ 100روپئے اجرت دی جاتی ہے، تو کیا اس اجرت کو قربانی کی قیمت میں شامل کر کے حصے داروں سے وصول کیا جا سکتا ہے؟

جواب:(4)

اجتماعی قربانی کے دوران حصے وصول کرنے والے محصلین (Collectors)

کو اجرت دی جاتی ہے، اور اس اجرت کو قربانی کے حصے داروں سے وصولی کی قربانی کی قیمت میں شامل کرنے کا مسئلہ شریعت کے اصولِ امانت اور اجرت کے احکام کے تحت آتا ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق، اگر یہ اجرت حصے داروں کی جانب سے متعین ہو یا ان کی اجازت سے دی جارہی ہو، تو اس اجرت کو قربانی کی لاگت میں شامل کرنا جائز ہوگا۔

شرعی اصول:

ا-محصلین کی اجرت کا جواز:

فقہ حنفی میں اجرت دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت ایک طے شدہ اور واضح معاہدے کے تحت ہو، اور اس کے بارے میں تمام حصے داروں کو پہلے سے آگاہ کردیا جائے۔

۲-قیمت میں اجرت شامل کرنے کی شرط:

اگر حصے داروں کو پہلے سے یہ بتایا گیا ہو کہ قربانی کی قیمت میں محصلین کی اجرت شامل ہوگی، تو اس صورت میں یہ شرعی طور پر درست ہوگا۔ لیکن اگر بغیر اطلاع کے اجرت کو قیمت میں شامل کیا جائے، تو یہ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ دھوکہ دہی کے زمرے میں آسکتا ہے۔

معتبر فقہی عبارات:

ا-الدرالمختار:

"یجوز اشتراط الأجرة علی العاملین فی الأمور المباحة إذا کان ذلک برضا الأطراف، وتدخل الأجرة ضمن التکلفة إذا صرحت بذلک" (الدر المختار، جلد6، صفحہ 417، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

ترجمہ: یہ جائز ہے کہ کسی مباح کام میں کام کرنے والوں پر اجرت مقرر کی جائے، بشرطیکہ یہ رضامندی کے ساتھ ہو، اور اگر اجرت کو لاگت میں شامل کیا جائے تو اس کا اعلان ضروری ہے۔

۲-فتاویٰ عالمگیری:

"إذا کان صاحب المال قد أذن بدفع الأجرة من ماله، فلا بأس بذلک، وإلا فلا یجوز إلا بإذنه" (فتاویٰ عالمگیری، جلد5، صفحہ 301، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: اگر مالکِ مال نے اپنی رقم سے اجرت دینے کی اجازت دی ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ بصورتِ دیگر یہ اجازت کے بغیر جائز نہیں ہوگا۔

۳-البحر الرائق:

"الأصل فی الإجارة أن تکون معلومة ومقبولة من الأطراف، ولا یجوز فرضها دون إعلام المستأجرین" (البحر الرائق، جلد 7، صفحہ 119، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اجرت کا اصول یہ ہے کہ وہ فریقین کے علم میں ہو اور ان کی منظوری سے ہو، اور اجرت کو کسی پر بغیر اطلاع کے نافذ کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ:

۱-اگر منتظمین حصے داروں کو پہلے سے واضح طور پر بتادیں کہ قربانی کی قیمت میں محصلین کی اجرت شامل ہوگی، تو شرعی طور پر اس کا وصول کرنا جائز ہے۔

۲-اگر یہ اطلاع نہ دی جائے، تو یہ عمل شرعاً ناجائز ہوگا۔

۳-منتظمین کو چاہیے کہ ہر چیز شفاف انداز میں طے کریں تاکہ امانت داری اور شریعت کے تقاضے پورے ہوں۔

اجتماعی قربانی کے جانور سے نفع حاصل کرنے کا حکم

سوال:5(الف)

کیا اجتماعی قربانی کا پیکج بنا کر فروخت کر کے دوسروں کی طرف سے قربانی کرنا اور اس سے نفع کمانا شرعا درست ہوگا؟ اس کی فقہی تخریج کیا ہوگی؟ یعنی یہ کس دائرہ میں آئے گا؛ خاص طور پر یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں ادارہ کے منتظمین قربانی کرنے والوں کی طرف سے وکیل بالشراء ووکیل بالتضحیہ ہونے کے ساتھ بائع بھی خود ہی ہوتے ہیں۔

جواب:5(الف)

اجتماعی قربانی کا پیکج بنا کر فروخت کرنا اور اس کے ذریعے نفع کمانا ایک پیچیدہ

مسئلہ ہے، جو بنیادی طور پر وکالت، بیع اور اجرت کے فقہی اصولوں پر مبنی ہے۔

یہاں دو اہم سوالات ہیں:

۱-کیا منتظمین کے لیے وکیل اور بائع (بیچنے والے) دونوں کے کردار کو یکجا کرنا جائز ہے؟

۲-اس عمل سے نفع کمانا شرعاً کیسا ہے؟

شرعی حیثیت:

فقہ حنفی کے مطابق، منتظمین کا ایک وقت میں وکیل اور بائع بننا ممکن ہے، لیکن اس کے لیے شریعت کے کچھ اصول وضوابط ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

۱-وکالت اور بیع کے اصول:

وکیل بالشراء ووکیل بالتضحیہ:

منتظمین کو جب کسی کی طرف سے قربانی خریدنے اور کرنے کا وکیل بنایا جاتا ہے، تو وہ ان کے لیے امانت دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بائع کا کردار:

اگر منتظمین جانور خود خریدتے ہیں اور پھر قربانی کے لیے لوگوں کو فروخت کرتے ہیں، تو یہ بیع ہے، اور اس میں نفع لینا جائز ہے بشرطیکہ قیمت اور دیگر شرائط پہلے سے واضح ہوں۔

۲-نفع کمانے کی شرائط:

شفافیت:

اگر منتظمین واضح طور پر لوگوں کو بتائیں کہ وہ قربانی کے جانور خرید کر بیچ رہے ہیں اور اس عمل سے نفع بھی کمار ہے ہیں، تو یہ جائز ہوگا۔

دھوکہ دہی سے اجتناب:

اگر منتظمین جانوروں کی قیمت میں غیر ضروری اضافہ کریں یا حصہ داروں کو صحیح معلومات فراہم نہ کریں، تو یہ شرعاً ناجائز ہوگا۔

۳-فقہی تخریج:

یہ عمل شرعاً وکالت مع الاجر یا بیع مع الاجرت کے دائرے میں آتا ہے، بشرطیکہ منتظمین کے کردار میں تضاد اور دھوکہ دہی نہ ہو۔

معتبر فقہی عبارات:

۱-الدر المختار:

"الوكيل إذا أخذ أجرة على عمله مع الإذن فلا بأس، بشرط أن يكون معلوماً للطرفين" (الدر المختار، جلد 5، صفحہ 381، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

ترجمہ: وکیل اگر اپنے عمل پر اجرت لیتا ہے اور اس پر دونوں فریق راضی ہوں، تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اجرت پہلے سے معلوم ہو۔

۲-فتاویٰ عالمگیری:

”**يجوز أن يجمع بين الوكالة والبيع إذا كان ذلك برضا الموكلين وبلا تدليس**“ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 313، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: وکالت اور بیع کو اکٹھا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ موکلین کی رضامندی ہو اور دھوکہ دہی نہ ہو۔

۳-البحر الرائق:

”**يجوز اتخاذ الربح في البيع إذا كان المشتري على علم بذلك، ولا يجوز الزيادة من غير علمه**“ (البحر الرائق، جلد 6، صفحہ 218، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: بیع میں نفع لینا جائز ہے، بشرطیکہ خریدار کو اس کی اطلاع دی گئی ہو، اور بغیر اطلاع کے اضافہ کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ:

۱-منتظمین اگر قربانی کا پیکج بنا کر فروخت کریں اور اس سے نفع کمائیں، تو یہ عمل شرعاً جائز ہوگا، بشرطیکہ:

حصہ داروں کو واضح طور پر بتایا جائے کہ منتظمین وکیل ہونے کے ساتھ بائع بھی ہیں۔

قیمت اور نفع میں شفافیت ہو۔

۲-اگر منتظمین اپنے کردار میں دھوکہ دہی یا تضاد کریں، تو یہ عمل ناجائز ہوگا۔

اہم تنبیہ:

منتظمین کو چاہیے کہ اس طرح کے معاملے میں شفافیت کو یقینی بنائیں، تاکہ حصہ داروں کا اعتماد اور شریعت کے اصول برقرار رہیں۔

اجتماعی قربانی کے لئے آئے ہوئے پیسوں سے جانور خریدا، اس پر نفع لے کر قربانی کا حکم

سوال:5(ب)

اجتماعی قربانی کے لئے اگر جانور پہلے سے خریدے ہوئے نہ ہوں؛ بلکہ حصوں کی رقم ملنے کے بعد جانور خریدے جائیں تو کیا حکم ہوگا؟ یعنی مثلا 100 جانور کے پیسے آئے اس کے بعد حصہ داروں کے پیسوں سے جانور خریدا اور اس پر نفع لے کر قربانی کیا تو یہ درست ہے یا نہیں؟

جواب:5(ب)

اجتماعی قربانی کے لیے اگر جانور پہلے سے خریدے ہوئے نہ ہوں بلکہ حصہ داروں کی رقم وصول ہونے کے بعد خریدے جائیں اور اس پر منتظمین نفع لے کر قربانی کریں، تو اس مسئلے کی شرعی حیثیت فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق درج ذیل ہے:

شرعی حیثیت:

۱-وکیل کی حیثیت:

اگر منتظمین حصہ داروں کی طرف سے وکیل ہیں اور ان کی رقم سے جانور خریدتے ہیں، تو وہ وکیل بالشراء اور وکیل بالتصحیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس صورت میں شرعی اصول کے تحت وکیل کو اپنے عمل پر نفع لینا جائز نہیں، کیونکہ وہ امانت دار ہیں اور امانت میں نفع لینا خیانت کے زمرے میں آتا ہے، جب تک کہ اس کی واضح اجازت نہ دی گئی ہو۔

۲-نفع لینے کی شرط:

اگر حصہ داروں کو پہلے سے واضح طور پر بتایا گیا ہو کہ منتظمین ان کی رقم سے جانور خریدیں گے اور اس پر ایک معقول نفع بھی شامل کریں گے، تو یہ بیع اور اجرت کے اصول کے تحت جائز ہوگا۔ لیکن اگر منتظمین اس بات کو مخفی رکھیں، تو یہ دھوکہ دہی شمار ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگی۔

۳-بیع اور وکالت کا تضاد:

فقہ حنفی میں وکیل اور بائع کا کردار بیک وقت ادا کرنا اصولی طور پر درست ہے، بشرطیکہ حصہ داروں کو اس کردار کی تبدیلی کے بارے میں مکمل علم ہو اور ان کی رضامندی حاصل ہو۔

معتبر فقہی عبارات:

ا-فتاویٰ عالمگیری:

"الوكيل إذا اشترى من مال موكله، فلا يجوز له أخذ الربح إلا إذا أذن له الموكل" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 305، مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: وکیل اگر اپنے موکل کے مال سے خریداری کرے، تو اسے نفع لینا جائز نہیں، جب تک کہ موکل اس کی اجازت نہ دے۔

۲-الدرالمختار:

"لا يجوز للوكيل أن يبيع أو يشتري لنفسه إلا إذا كان ذلك معلناً ورضي الموكل" (الدرالمختار، جلد 6، صفحہ 417، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

ترجمہ: وکیل کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لیے خرید وفروخت کرے، جب تک کہ یہ عمل واضح طور پر ظاہر نہ کیا جائے اور موکل اس پر راضی ہو۔

۳-البحرالرائق:

"إذا كان الوكيل يعمل لصالح موكله وأخذ أجرة على ذلك، فلا يجوز له الربح من المعاملة نفسها" (البحرالرائق، جلد 7، صفحہ 242، مطبع دارالکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اگر وکیل اپنے موکل کے فائدے کے لیے کام کر رہا ہو اور اسے اس پر اجرت مل رہی ہو، تو اس کے لیے اسی معاملے سے نفع لینا جائز نہیں۔

خلاصہ:

۱-اگر منتظمین حصہ داروں کی طرف سے وکیل ہیں اور ان کی رقم سے جانور خریدتے ہیں، تو انہیں نفع لینے کا حق نہیں، جب تک کہ حصہ داروں کو واضح طور پر اطلاع دے کر ان کی رضامندی حاصل نہ کی جائے۔

۲-اگر منتظمین حصہ داروں کو پہلے سے یہ بتادیں کہ وہ جانور خریدنے کے بعد معقول نفع لیں گے، تو یہ عمل جائز ہوگا، بشرطیکہ دھوکہ دہی نہ ہو اور معاملہ شفاف ہو۔

۳-اگر نفع لینے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور منتظمین نے خاموشی سے نفع لیا، تو یہ ناجائز اور خیانت کے زمرے میں آئے گا۔

اجتماعی قربانی کے لئے مدرسہ کے پیسوں سے جانور خریدنے کا حکم

سوال:5(ج)

کیا کوئی دینی مدرسہ منفعت وفائدے کے پیش نظر نیز اس بنا پر کہ لوگوں کی قربانیاں بے غبار طریقے پر ادا ہو جائیں، مدرسہ کے مال سے اجتماعی قربانی کا نظم کرسکتا ہے؟

جواب:5(ج)

کسی دینی مدرسہ کے لیے اجتماعی قربانی کا نظم کرنے میں، اگر شرعی اصولوں

کی رعایت رکھی جائے اور قربانی کے تمام احکام وشرائط صحیح طریقے سے ادا ہوں، تو یہ جائز ہے۔ تاہم، اس میں چند امور کی وضاحت ضروری ہے:

۱- مدرسہ کے مال سے قربانی کے لیے جانور خریدنا:

اگر مدرسہ قربانی کے لیے پہلے سے جانور خریدتا ہے اور پھر حصہ داروں سے رقم وصول کر کے ان کے حصے محفوظ کرتا ہے، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ مدرسہ اپنے مال پر نفع نہ لے اور تمام معاملات شفافیت کے ساتھ طے کیے جائیں۔

۲- مدرسہ کا مقصد منفعت ہو:

اگر مدرسہ اس عمل سے صرف منفعت یا مالی فائدہ حاصل کرنے کی نیت رکھتا ہو، تو یہ نیت درست نہیں؛ کیونکہ دینی کاموں کا مقصود خالص اللہ کی رضا اور خدمت دین ہونا چاہیے۔

۳-شرعی احکام کی رعایت:

قربانی کے احکام، مثلاً جانور کا صحیح ہونا، حصہ داروں کی نیت کا درست ہونا، اور تمام شرعی تقاضے پورے کرنا ضروری ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالے:

۱-فتاویٰ عالمگیری میں اجتماعی قربانی کے معاملات کی وضاحت ان الفاظ میں ہے:

"إذا اشترك سبعة في الأضحية فلابد أن يكون المقصود بها القربة، ولا تجوز الشركة إذا قصد البعض اللحم فقط دون القربة" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 300، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر سات افراد قربانی میں شریک ہوں، تو ان کا مقصد قربت (اللہ کی رضا) ہونا چاہیے، محض گوشت کا حصول کافی نہیں۔

۲- الدر المختار میں آیا ہے:

"ولا بأس أن يضحي الجماعة ببهيمة واحدة إذا كان كل واحد منهم يريد القربة" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 6، صفحہ 326، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: یہ جائز ہے کہ کئی لوگ ایک جانور میں قربانی کریں، بشرطیکہ ہر ایک کا مقصد قربت الٰہی ہو۔

۳- رد المحتار میں اجتماعی قربانی کے لیے یہ اصول بیان ہوا ہے:

"وإن كان الجامع في ذلك التعاون على البر فلا مانع شرعا"

(رد المحتار، جلد 6، صفحہ 329، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: اگر اجتماعی قربانی کا مقصد نیکی میں تعاون ہو، تو شرعاً اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

خلاصہ:

مدرسہ اگر اجتماعی قربانی کا نظم لوگوں کی سہولت اور دینی خدمت کے لیے کرتا

ہے، تو یہ جائز ہے۔ تاہم، اس میں مالی منفعت کو بنیاد بنانا درست نہیں، اور تمام شرعی تقاضوں کی مکمل رعایت ضروری ہے۔

اجتماعی قربانی کا صاف وشفاف طریقہ

سوال: (6)

اجتماعی قربانی کا شرعی اعتبار سے درست اور شفاف نیز موجودہ زمانے میں قابل عمل طریقہ کار آپ کے نزدیک کیا ہوسکتا ہے؟ ایک تفصیلی خاکہ تحریر فرمائیں جس میں مرحلہ وار تمام امور کا ذکر ہو، نیز اس میں تبرعا اور تجارۃ دونوں صورتوں سے متعلق جزئیات کی رعایت بھی موجود ہو۔

جواب: (6)

اجتماعی قربانی کا نظام موجودہ دور میں ایک سہولت بخش اور ضروری عمل ہے، لیکن اس کا طریقہ کار ایسا ہونا چاہیے جو شریعت کے اصولوں کے مطابق ہو اور ہر قسم کے شبہات اور خامیوں سے پاک ہو۔ ذیل میں اجتماعی قربانی کے لیے ایک تفصیلی اور شفاف طریقہ کار پیش کیا جاتا ہے، جس میں تبرعاً (بلا نفع) اور تجارۃ (نفع کے ساتھ) دونوں صورتوں کی رعایت کی گئی ہے۔

قربانی کے شرعی اصولوں پر مبنی تفصیلی خاکہ:

مرحلہ 1: منصوبہ بندی اور ابتدائی اقدامات:

۱-نیت کی اصلاح:

نیت خالصتاً اللہ کی رضا اور عوام کی سہولت ہونی چاہیے۔

تجارتی مقاصد کے لیے اجتماعی قربانی کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے، لیکن شفافیت لازمی ہے۔

۲-اجازت اور شراکت داری کا اصول:

حصہ لینے والے افراد سے واضح طور پر اجازت لی جائے کہ مدرسہ یا منتظمین ان کی طرف سے جانور خریدیں اور قربانی کریں۔

شرعی اصول کے مطابق، ہر شریک کا مقصد قربتِ الٰہی ہونا چاہیے۔

مرحلہ 2: حصہ داروں کی شمولیت:

۱-اعلان اور اطلاع:

حصہ داروں کو واضح طور پر رقم، جانور، اور قربانی کے تمام تفصیلات کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔

حصہ داروں کو ان کے حصے کی رقم پہلے سے جمع کرانی ہوگی۔

۲-شرکاء کی تفصیلات کا اندراج:

ہر حصہ دار کا نام، رقم، اور ان کی نیت (قربت الٰہی) کا باقاعدہ اندراج کیا جائے۔

شفافیت کے لیے رسید یا تحریری معاہدہ فراہم کیا جائے۔

مرحلہ 3: جانوروں کی خریداری:

۱-جانوروں کا انتخاب:

شرعی معیار کے مطابق صحت مند اور عیب سے پاک جانور خریدے جائیں۔

خریداری میں شفافیت کا مظاہرہ کیا جائے اور حصہ داروں کو قیمت سے آگاہ کیا جائے۔

۲-تبرعاً یا تجارۃً کے اصول:

تبرعاً: اگر مدرسہ یا منتظمین بغیر نفع کے یہ کام کرتے ہیں تو حصہ داروں سے صرف جانور کی اصل قیمت وصول کی جائے۔

تجارۃً: اگر یہ عمل تجارتی بنیاد پر ہو تو نفع کی شرح پہلے سے واضح کی جائے۔

مرحلہ 4: قربانی کا عمل:

۱-جانوروں کی قربانی:

شرعی اصول کے مطابق قربانی کی جائے، یعنی وقت پر اور درست طریقے سے ذبح کیا جائے۔

ہر شریک کے حصے کا گوشت اور دیگر تفصیلات مکمل طور پر محفوظ رکھی جائیں۔

۲-قربانی کے دوران کی نیت:

قربانی کرنے والا واضح طور پر ہر شریک کی طرف سے قربانی کی نیت کرے۔

مرحلہ 5: گوشت کی تقسیم:

۱-حصے داروں میں تقسیم:

گوشت کو ہر شریک کے حصے کے مطابق شریعت کے اصولوں کے تحت تقسیم کیا جائے۔

شفافیت کے لیے گوشت کا وزن اور حصہ داروں کی تفصیلات درج کی جائیں۔

۲-تبرعات:

اگر کوئی حصہ دار اپنے حصے کا گوشت مدرسہ یا مستحقین کو دینا چاہے، تو اس کی اجازت بھی تحریری طور پر لی جائے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے:

۱-الدر المختار میں شراکت کے اصول یوں بیان کیے گئے ہیں:

"**وشرط صحة الشركة اتحاد الجنس والمقصود**" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 6، صفحہ 326، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: شراکت کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جنس اور مقصد ایک ہو۔

۲-فتاویٰ ہندیہ میں وضاحت ہے:

"لا بأس بالاشتراک فی الأضحیة إذا کانت النیة للقربة" (فتاویٰ ہندیہ، جلد 5، صفحہ 300، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: قربانی میں شراکت جائز ہے، بشرطیکہ نیت قربتِ الٰہی ہو۔

۳-بدائع الصنائع میں آیا ہے:

"ویجوز الاشتراک فی الأضحیة بشرط أن تکون نیة الجمیع القربة" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 71، مطبع دارالکتب العربی، قاہرہ)

ترجمہ: قربانی میں شراکت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ سب کی نیت قربت ہو۔

خلاصہ:

مدرسہ یا منتظمین کے لیے اجتماعی قربانی کا نظام شریعت کے اصولوں کے تحت جائز ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو، شرعی احکام کی پابندی ہو، اور شفافیت کا مکمل اہتمام ہو۔ تبرعاً اور تجارۃ دونوں صورتیں جائز ہیں، لیکن ہر صورت میں شرکاء کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا اور نفع یا نقصان کے بارے میں وضاحت کرنا لازم ہے۔

☆☆☆

جانوروں کی مصنوعی افزائش

جانوروں میں تلقیح کا حکم

سوال:(1)

تلقیح کا عمل اگر جانوروں میں کیا جائے تو شرعا اس کا کیا حکم ہوگا؟ اور کن اصولوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا؟ اگر کسی نسل کو بچانے کے لیے تلقیح کا عمل کیا جائے یا تعداد بڑھانے اور نفع بخش بنانے کے لیے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

جواب:(1)

جانوروں میں مصنوعی افزائشِ نسل (Artificial Insemination) یا تلقیح کے عمل کا حکم شرعی اعتبار سے جواز کے دائرے میں آتا ہے، بشرطیکہ اس میں شرعی اصولوں کی مکمل رعایت کی جائے اور کوئی ناجائز یا ممنوع امر نہ پایا جائے۔

فقہی دلائل اور اصول:

فقہ حنفی میں اصول یہ ہے کہ ایسے امور میں اصل جواز ہے، جب تک کوئی واضح شرعی ممانعت موجود نہ ہو۔ جانوروں میں نسل بڑھانے یا نسل بچانے کے لیے یہ عمل چونکہ نفع بخش ہے اور انسانی ضرورت کے لیے اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا یہ مباح ہوگا،

لیکن اس کے جواز کے لیے چند شرائط کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

شرائط:

۱-**نطفہ (منی) کا استعمال:** نطفہ کا استعمال صرف حلال جانوروں کے درمیان ہونا چاہیے۔

۲-**حرمتِ نسب کا خیال:** اس عمل سے کسی بھی غیر شرعی صورت میں نسب کے خلط ملط ہونے کا خدشہ نہ ہو۔

۳-**جانور کی تکلیف:** عمل کے دوران جانور کو غیر ضروری تکلیف نہ دی جائے۔

۴-**مالی نقصان یا دھوکہ دہی:** اس عمل کے ذریعے کسی قسم کا دھوکہ، ظلم یا مالی نقصان نہ ہو۔

فقہی کتب سے حوالہ:

۱-فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے:

"وَالأَصْلُ فِي الأَشْيَاءِ الإِبَاحَةُ إِلاَّ مَا دَلَّ الدَّلِيلُ عَلَى تَحْرِيمِهِ"

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 343، مطبع: مکتبۃ رشیدیہ)

ترجمہ: اشیاء میں اصل اباحت ہے، سوائے ان کے جن کے بارے میں تحریم کی دلیل قائم ہو۔

۲-البحر الرائق میں ہے:

"مَا يَتَعَلَّقُ بِالنَّسْلِ إِنْ كَانَ فِيهِ مَصْلَحَةٌ وَلاَ ضَرَرَ فَهُوَ جَائِزٌ"

(البحر الرائق، جلد 8، صفحہ 206، مطبع: دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: جو چیز نسل سے متعلق ہو اور اس میں مصلحت ہو جبکہ کوئی نقصان نہ ہو تو وہ جائز ہے۔

۳- ردالمحتار میں علامہ شامی فرماتے ہیں:

"إِنْ كَانَتْ حَاجَةٌ إِلَى تَكْثِيرِ النَّسْلِ فَلاَ بَأْسَ بِهِ مَعَ رِعَايَةِ الضَّوَابِطِ الشَّرْعِيَّةِ" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 401، مطبع: دار الفکر)

ترجمہ: اگر نسل بڑھانے کی ضرورت ہو تو شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ اس میں کوئی حرج نہیں۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کی روشنی میں جانوروں کی مصنوعی افزائش نسل یا تلقیح کا عمل شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ شرعی اصولوں اور شرائط کی پابندی کی جائے۔ اگر یہ نسل بچانے یا تعداد بڑھانے کے لیے ہو، اور اس میں کوئی غیر شرعی امر نہ پایا جائے، تو اس کی اجازت ہوگی۔

جانوروں کی افزائش کے لئے انجکشن لگانے کا حکم

سوال:(2)

عام طور پر جن بھی غذاؤں کا رواج ہے ان میں گائے، بھینس، بکرا، بکری،

مینڈھا، دنبہ اور مرغ ہیں، کاروباری حضرات بڑے پیمانے پر جانوروں کو بازار میں لانے کے لیے ایسے انجکشن دیتے اور ایسی دوائیں کھلاتے ہیں جن سے افزائش بڑی تیزی سے ہوتی ہے اور وہ قبل از وقت کھانے کے لائق ہوجاتے ہیں، شرعا اس کا حکم کیا ہے؟

جواب:(2)

گائے، بھینس، بکری، مرغ وغیرہ کی افزائش کے لیے دوائیں یا انجکشن کا استعمال اگرچہ موجودہ دور میں عام ہے، لیکن شرعاً اس کا حکم درج ذیل تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

۱-اصل حکم:

اگر یہ انجکشن یا دوائیں انسان کے لیے مضر نہ ہوں اور اس سے جانور کی صحت پر برا اثر نہ پڑے، نیز ان کے گوشت میں مضر اثرات منتقل نہ ہوں، تو ان کا استعمال جائز ہے۔

۲-نقصان دہ انجکشن اور دوائیں:

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان دواؤں یا انجکشن کے استعمال سے جانور کا گوشت انسانی صحت کے لیے مضر ہو جاتا ہے یا جانور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں ان دواؤں یا انجکشن کا استعمال ناجائز اور حرام ہوگا۔

۳-اصولی دلیل:

فقہاء نے بیان کیا ہے کہ:

کسی چیز کا استعمال اسی وقت جائز ہے جب وہ نہ کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ ہی وہ مکروہ یا حرام کی کسی صورت میں آتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو طیب (پاکیزہ) ہیں اور خبیث چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ'' (سورہ الاعراف، آیت 157)

ترجمہ: ''اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور گندی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں''۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب سے حوالے:

۱-فتاویٰ شامی (ردالمحتار):

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''وَإِنْ كَانَ فِي تَعَاطِي الْمَأْكُولِ أَوِ الْمَشْرُوبِ ضَرَرٌ بَيِّنٌ حَرُمَ تَنَاوُلُهُ، لِأَنَّ الشَّرْعَ نَهَى عَمَّا فِيهِ ضَرَرٌ'' (ردالمحتار علی الدر المختار، ج9،ص 408، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کھانے یا پینے کی چیز میں واضح نقصان ہو تو اس کا استعمال حرام

ہوگا، کیونکہ شریعت نے ہر نقصان دہ چیز سے منع کیا ہے۔

۲-الہدایہ:

علامہ برہان الدین مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

"وَلَا يَجُوزُ شُرْبُ مَا فِيهِ ضَرَرٌ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (الہدایہ، ج4،ص436، مطبع مکتبہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

ترجمہ: کسی ایسی چیز کا استعمال جائز نہیں جس میں نقصان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

۳-بدائع الصنائع:

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"كُلُّ مَا يُؤَدِّي إِلَى الضَّرَرِ فَهُوَ حَرَامٌ، وَإِذَا ثَبَتَ أَنَّ فِي اللُّحُومِ أَوِ الشَّرَابِ ضَرَرًا، لَمْ يَجُزْ تَنَاوُلُهُ" (بدائع الصنائع، ج5،ص113، مطبع دارالکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو نقصان پہنچانے والی ہو، وہ حرام ہے، اور اگر گوشت یا مشروبات میں نقصان ثابت ہو جائے، تو اس کا استعمال جائز نہیں۔

خلاصہ ونتیجہ:

۱-اگر ان دواؤں یا انجکشن کے استعمال سے جانور کے گوشت میں انسانی صحت کے لیے نقصان دہ اجزاء منتقل ہو جاتے ہیں، تو یہ حرام ہے۔

۲-اگر جانور کو غیر معمولی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا استعمال بھی جائز نہیں۔

۳-اگر ان دواؤں کا کوئی نقصان ثابت نہ ہو، تو ان کا استعمال جائز ہے۔

لہٰذا، کاروباری حضرات کو چاہیے کہ وہ ان دواؤں اور انجکشن کے استعمال سے پہلے ماہرینِ صحت سے تحقیق کرلیں کہ آیا یہ انسان کے لیے نقصان دہ ہیں یا نہیں۔ نیز حکومت کو چاہیے کہ وہ ان امور پر سخت نگرانی کرے تاکہ لوگوں کی صحت محفوظ رہ سکے۔

مرغیوں کی افزائش کے لئے مختلف چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال:(3)

اسی طرح پولیٹری فارم کا ایک بڑا کاروبار ہے جہاں مرغیوں کو مصنوعی طریقہ سے بڑھایا جاتا ہے، پھر وہ بازار میں فروخت کی جاتی ہیں، شرعی نقطۂ نظر سے اس عمل افزائش کی کیا حیثیت ہوگی؟ اور اس طرح کے جانوروں کے استعمال کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:(3)

پولیٹری فارم میں مرغیوں کی مصنوعی افزائش، یعنی ان کے نشوونما کو بڑھانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرنا، جیسے مخصوص خوراک دینا، ویکسین لگانا یا ادویات کا استعمال کرنا، اس کی شرعی حیثیت درج ذیل اصولوں کی روشنی میں واضح کی جاتی ہے:

پہلا مسئلہ: مصنوعی افزائشِ حیوانات کا حکم:

شریعت میں اصل یہ ہے کہ کوئی بھی عمل جائز ہے جب تک کہ وہ حرام یا مکروہ

نہ ہو۔ اگر مصنوعی طریقۂ افزائش سے مرغیوں کو کوئی ظاہری ضرر نہ پہنچے اور یہ عمل شریعت کے عمومی اصولوں کے خلاف نہ ہو، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

فقہ حنفی میں قاعدہ ہے:

"الأصل فی الأشیاء الإباحة حتی یدل الدلیل علی التحریم"

(الاشباہ والنظائر، جلد 1، صفحہ 62، مطبع: دارالکتب العلمیۃ)

ترجمہ: "اشیاء میں اصل اباحت (جواز) ہے، جب تک کہ حرمت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو"۔

دوسرا مسئلہ: مصنوعی طریقے سے بڑھائے گئے جانور کا استعمال:

ایسی مرغیاں جو مصنوعی طریقے سے خوراک یا دوائی کے ذریعے بڑھائی گئی ہوں، اگر وہ طبعی طور پر حلال ہوں (جیسے مرغی)، اور ان میں کوئی مضر اثر نہ پایا جائے، تو ان کا کھانا جائز ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"فکل حیوان طاهر اللحم، مذبوح علی الوجه الشرعی، یجوز أکله" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، صفحہ 306، مطبع: دارالفکر)

ترجمہ: "ہر وہ حیوان جس کا گوشت پاک ہو اور اسے شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہو، اس کا کھانا جائز ہے"۔

لہٰذا، اگر مرغیوں کو دی جانے والی خوراک میں کوئی حرام یا نجس چیز نہ ہو اور

ان کے گوشت میں نقصان دہ اثرات نہ پائے جائیں، تو ان کا کھانا جائز ہے۔

تیسرا مسئلہ: اگر مصنوعی طریقے سے ضرر پہنچے:

اگر پولٹری فارم میں مرغیوں کو دی جانے والی ادویات یا خوراک ایسی ہو جس سے ان میں مضرِ صحت اثرات پیدا ہوں اور انسانوں کے لیے نقصان دہ ہو، تو ایسی مرغیوں کا استعمال ناجائز ہوگا۔

فقہ حنفی میں اصول ہے:

"کل ما ثبت ضررہ ثبت تحریمہ" (الأشباہ والنظائر، جلد 1، صفحہ 137، مطبع: دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: "ہر وہ چیز جس کا ضرر (نقصان) ثابت ہو جائے، اس کی حرمت بھی ثابت ہو جائے گی"۔

خلاصۂ کلام:

۱- پولیٹری فارم میں مصنوعی طریقے سے مرغیوں کی افزائش اصل میں جائز ہے، بشرطیکہ اس عمل میں کوئی حرام یا نقصان دہ چیز شامل نہ ہو۔

۲- ایسی مرغیاں جنہیں حلال اور پاکیزہ خوراک دی گئی ہو، اور جن کے گوشت میں کوئی نقصان دہ اثرات نہ ہوں، ان کا کھانا جائز ہے۔

۳- اگر مرغیوں کی افزائش میں استعمال ہونے والے طریقے یا خوراک سے ضرر ثابت ہو جائے، تو ان کا استعمال ناجائز ہوگا۔

مچھلیوں کی افزائش کا حکم

سوال:(4)

مچھلی کی بھی مصنوعی افزائش ہوتی ہے، کاروبار کرنے اور کھانے پینے کے اعتبار سے اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:(4)

مصنوعی طریقے سے مچھلی کی افزائش، جسے آج کل "Fish Farming" یا ''مچھلی کی پرورش'' کہا جاتا ہے، اس کا تعلق جدید صنعتی ذرائع سے ہے، جہاں پانی کے حوضوں یا تالابوں میں مچھلیوں کی پرورش کی جاتی ہے۔

فقہ حنفی میں مچھلی کی افزائش اور اس کے کاروبار کا حکم:

فقہ حنفی کے مطابق مچھلی کو کھانا جائز ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ'' (سورۃ المائدہ، آیت:96)

ترجمہ:''تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے، تاکہ وہ تمہارے لیے اور مسافروں کے لیے فائدہ مند ہو''۔

مصنوعی افزائش کے بارے میں فقہی نقطۂ نظر:

فقہاء کرام نے مچھلی کے کھانے کی شرط یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ ''سمندر یا پانی میں زندہ ہو اور مرنے کے بعد از خود پانی پر آئے''، چاہے وہ قدرتی طریقے سے ہو یا مصنوعی طریقے سے پرورش دی گئی ہو۔

ا-علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''لا تحل السمكة إلا إذا ماتت حتف أنفها، أما إذا خرجت من الماء و ماتت فإنها حلال'' (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، صفحہ 306، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: ''مچھلی اس وقت حلال ہوگی جب وہ قدرتی موت مرے، لیکن اگر وہ پانی سے باہر نکالنے کے بعد مرے تو بھی وہ حلال ہے''۔

۲-امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''و لا بأس بأن يصطادها الإنسان ويجمعها في الأحواض ويربيها ثم يأخذها و يبيعها لأنها طاهرة و ميتتها طاهرة'' (المبسوط، جلد 11، صفحہ 231، مطبع دار المعرفۃ)

ترجمہ: ''اس میں کوئی حرج نہیں کہ انسان مچھلی کا شکار کرے، اسے تالاب میں رکھ کر پرورش کرے، پھر اسے بیچ دے، کیونکہ مچھلی پاک ہے اور اس کی موت (پانی میں) بھی پاک ہے''۔

۳-فقہ حنفی کے دیگر متقدمین فرماتے ہیں:

"السمكة إذا كانت من البحر أو ما فی حكم البحر فهی حلال بيعها و أكلها" (الھدایۃ، جلد 4، صفحہ 201، مطبع دار احیاء التراث العربی)

ترجمہ: ''مچھلی جب سمندر یا سمندر کے حکم میں پانی سے حاصل کی گئی ہو، تو اس کی بیع اور کھانا حلال ہے''۔

نتیجہ:

مصنوعی افزائش شدہ مچھلی (Fish Farming) کا کاروبار کرنا اور ایسی مچھلی کا کھانا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ:

۱-مچھلی کی پرورش جائز طریقے پر ہو۔

۲-مچھلی مردار (پانی میں مرنے) کی حالت میں ہو، نہ کہ پانی سے باہر نکال کر ماری گئی ہو۔

یہ طریقہ کاروبار بھی جائز ہے، کیونکہ مچھلی حلال طعام میں شمار ہوتی ہے، اور اسے بیچنا اور اس کا کھانا اسلامی تعلیمات کے مطابق درست ہے۔

افزائش کے لئے نجس اور حرام اشیاء کے ملانے کا حکم

سوال: (5)

مصنوعی افزائش کے لیے غذا میں نجس اور حرام اجزاء ملائے جاتے ہیں، جن

جانوروں کو مسلسل ایسی غذا دے کر تیار کیا جائے ان کا گوشت پاک ہوگا یا نہیں؟ کیا وہ جلالہ (نجاست خور جانور) کے زمرہ میں تو نہیں آئے گا؟ اسی طرح جو انجکشن دیا جاتا ہے، اس میں بھی مضر اجزاء اور نقصان دہ کیمیکل ہوتے ہیں، اس کا لگانا کس حد تک درست ہوگا؟

جواب: (5)

پہلا مسئلہ: غذا میں نجس اور حرام اجزاء کی ملاوٹ اور اس کا اثر:

فقہ حنفی کے مطابق اگر جانور کو مسلسل نجس یا حرام غذا دی جائے، تو وہ ''جلالہ'' کہلاتا ہے۔ جلالہ وہ جانور ہوتا ہے جو نجاست یا حرام چیزوں کا عادی ہو جائے اور اس کا گوشت، دودھ یا انڈے بدبودار یا نجاست کی تاثیر کے حامل ہو جائیں۔

فقہی دلائل:

ا-ہدایہ میں ہے:

''ولا یحل أکل الجلالۃ، وھی التی تأکل العذرۃ حتی ینتن ریحھا، ویحل لبنھا بعد حبسھا واعتدالھا'' (ہدایہ، جلد 4، صفحہ 448، مکتبہ رشیدیہ)

ترجمہ: جلالہ کا کھانا حلال نہیں ہے، وہ جانور جو نجاست کھا کر بدبودار ہو جائے، لیکن اسے قید کر کے پاک غذا دی جائے اور بدبو ختم ہو جائے تو اس کا دودھ حلال ہوگا۔

۲-مبسوط میں امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الجلالۃ إذا تغیّر لحمھا أو ریحھا لأکل العذرۃ، لا یحل أکلھا،

لأنّ النتن سبب للضرر" (المبسوط، جلد 11، صفحہ 243، دار المعارف)

ترجمہ: جلالہ اگر نجاست کھانے کی وجہ سے اس کے گوشت یا بدبو میں تغیر آ جائے، تو اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا کیونکہ بدبو نقصان دہ ہوتی ہے۔

خلاصہ:

اگر کسی جانور کو مسلسل نجس اور حرام غذا دی جائے اور اس کے گوشت میں بدبو پیدا ہو جائے یا طبیعت میں خرابی محسوس ہو، تو ایسا جانور جلالہ ہوگا۔ اسے پاک غذا پر کچھ دن قید رکھنا ضروری ہوگا تاکہ اس کے جسم سے نجاست کی تاثیر ختم ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ: انجکشن میں مضر اجزاء کا استعمال:

اگر انجکشن میں مضر اور نقصان دہ کیمیکل شامل ہوں، تو ان کے استعمال کا حکم انسانی صحت اور طبی ضرورت پر منحصر ہوگا۔ فقہ کا یہ اصول ہے کہ:

"**الضرورات تبيح المحظورات**" (درمختار، جلد 1، صفحہ 155، مکتبہ زکریا)

ترجمہ: ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز بنا دیتی ہیں۔

مزید دلائل:

ا- الاشباہ والنظائر میں امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**إذا تعيّن الشفاء بتركيب محرم، جاز استعماله بقدر الضرورة**"

(الاشباہ والنظائر، صفحہ 85، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اگر شفاء صرف حرام مرکب کے استعمال پر منحصر ہو تو ضرورت کے مطابق اس کا استعمال جائز ہے۔

۲-بدائع الصنائع میں ہے:

"إذا كان العلاج بالنجس يتوقّف عليه الحياة أو شفاء المرض، جاز استعماله" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 78، دار الکتب العربی)

ترجمہ: اگر نجس چیز کے ذریعے علاج زندگی یا صحت کی بقاء کے لیے ضروری ہو، تو اس کا استعمال جائز ہوگا۔

خلاصہ ونتیجہ:

۱-اگر جانور کو مسلسل نجس یا حرام غذا دی جائے اور اس کی بدبو یا طبیعت میں خرابی ظاہر ہو جائے، تو وہ جلالہ کے زمرے میں آئے گا۔ ایسے جانور کو حلال کرنے کے لیے پاک غذا پر کچھ مدت رکھنا ضروری ہوگا۔

۲-اگر گوشت میں کوئی بدبو یا خرابی نہ ہو، تو ایسا جانور جلالہ نہیں کہلائے گا، اور اس کا گوشت پاک اور حلال ہوگا۔

۳-انجکشن میں اگر مضر اجزاء ہوں، تو اس کا استعمال طبی ضرورت اور ماہر ڈاکٹروں کی تشخیص کی بنیاد پر جائز ہوگا، کیونکہ ضرورت کے وقت ممنوع چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

جانوروں میں تغییر خلقت کا حکم

سوال:(6)

بہت سے اہل ثروت اپنا شوق پورا کرنے اور فخر و مباہات کے لیے نسلی جانوروں میں تغییر خلقت کی کوشش کرتے ہیں اور کتوں کی مختلف نسلوں کو تیار کیا جاتا ہے، یورپ سے لے کر ایشیا تک انہیں قابل اعتناء اور پر کشش بنانے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، بسا اوقات کلوننگ کے ذریعے افزائش کی کوشش کی جاتی ہے،شریعت کی نگاہ میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:(6)

سوال میں ذکر کردہ عمل یعنی جانوروں کی کلوننگ اور افزائش نسل کے لیے تغییر خلقت کے مختلف طریقے،شریعتِ اسلامیہ کی نظر میں غیر فطری اور ممنوعہ عمل ہے، اور اس پر کئی شرعی اصولوں کی روشنی میں کلام کیا جا سکتا ہے۔فقہ حنفی میں اس کی کئی بنیادیں موجود ہیں۔

دلائل شرعیہ:

۱۔تغییرِ خلقت کی ممانعت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شیطان کے وسوسے اور اس کی وسعتِ عمل کے

ذکر میں ارشاد فرمایا:

"وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا" (النساء:119)

ترجمہ: اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالیں گے، اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو ولی بنائے گا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں:

"والمراد بتغيير خلق الله كل تغيير في الخلقة الأصلية بغير ضرورة أو مصلحة شرعية يعتبر من عمل الشيطان" (تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 348، دار ابن حزم)

ترجمہ: اللہ کی خلقت میں تغیر سے مراد ہر وہ تبدیلی ہے جو بغیر ضرورت اور شرعی مصلحت کے ہو، یہ شیطانی عمل میں شمار ہوگا"۔

۲- حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں پر لعنت فرمائی جو تغییر خلقت پر مشتمل ہوں:

"لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالنَّامِصَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ" (صحیح مسلم، حدیث:2125)

ترجمہ: اللہ نے گودنے والیوں، گدوانے والیوں، ابروؤں کے بال نوچنے والیوں، دانتوں میں فاصلہ کرنے والیوں (حسن کے لیے) اور اللہ کی تخلیق میں تبدیلی

کرنے والیوں پر لعنت فرمائی ہے۔

اس حدیث میں تغییرِ خلقت کو ایک شیطانی اور لعنت زدہ عمل قرار دیا گیا ہے، جبکہ کلوننگ اور غیر فطری طریقوں سے افزائش نسل بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔

۳-فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے دلائل:

فقہ حنفی میں ''تغییر خلقت'' اور غیر فطری تبدیلیوں کے بارے میں اصولی طور پر یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی تبدیلی کا تعلق ضرورتِ شرعیہ سے نہ ہو تو وہ ناجائز ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"والأصل أن كل ما فيه تغيير لخلق الله تعالى فهو حرام، إلا إذا اقتضت الضرورة أو دعت إليه حاجة شرعية" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد 8، صفحہ 217، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: ''اصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں اللہ کی تخلیق میں تبدیلی ہو، وہ حرام ہے، الا یہ کہ ضرورت شرعیہ اس کا تقاضا کرے یا شرعی حاجت پیش آئے''۔

امام سرخسیؒ نے ''المبسوط'' میں فرمایا:

"وإن كان التغيير ليس لمصلحة دينية ولا حاجة ضرورية، فهو عبث واتباع لأمر الشيطان" (المبسوط، جلد 11، صفحہ 81، دار المعرفہ)

ترجمہ: اگر یہ تبدیلی کسی دینی مصلحت یا ضروری حاجت کے لیے نہ ہو، تو یہ محض لغو اور شیطان کے حکم کی اتباع ہے''۔

نتیجہ:

جانوروں کی نسل میں غیر فطری طریقوں جیسے کلوننگ اور تغییرِ خلقت کے دیگر ذرائع استعمال کرنا، شریعتِ اسلامیہ میں حرام ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کی تخلیق میں غیر ضروری اور بے مقصد مداخلت ہے، جسے قرآن نے شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ فقہ حنفی کے اصول بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ بغیر کسی شرعی ضرورت کے خلقت میں تبدیلی ناجائز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جانوروں کو تکلیف دہ مراحل سے گزارنے کا حکم

سوال: (7)

حفاظتی دستہ اور قانونی و جاسوسی مقاصد کے تحت گھوڑے، کتے، یا طبی ریسرچ کے لیے چوہے اور دیگر کئی طرح کے جانوروں کی افزائش اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کو خاص انجکشن دے کر ٹریننگ کے ایسے مراحل سے گزارا جاتا ہے جن کا جانور مکلف نہیں ہوتا، اسی طرح بعض جانوروں کی نسل اگر عنقا ہو رہی ہو تو ان کو میڈیکل پروسیس (Process) سے بھی گزارا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ جانوروں کی حق تلفی تو نہیں ہے؟

جواب:(7)

اسلامی شریعت میں جانوروں کے حقوق کا تحفظ ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔

جانوروں کو مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا اصول:

فقہ حنفی اور دیگر اسلامی مذاہب میں جانوروں کو انسان کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ کچھ شرائط وضوابط بھی مقرر کیے گئے ہیں:

۱-جانوروں کو غیر ضروری تکلیف دینا حرام ہے۔

۲-ان کا استعمال جائز اور ضرورت کے دائرے میں ہونا چاہیے۔

۳-اگر کسی جانور کی نسل ختم ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی افزائش جائز مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔

حفاظتی دستہ اور قانونی مقاصد کے لیے کتے وغیرہ کی تربیت:

کتوں کو حفاظتی مقاصد، شکار اور دیگر قانونی ضرورتوں کے لیے پالنا جائز ہے۔ فقہ حنفی میں یہ بات موجود ہے کہ اگر کسی جائز مقصد کے تحت کتے پالے جائیں، تو یہ عمل درست ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

”یحل اقتناء الکلب للصید، والحراسة، والزرع، والماشیة. لحدیث الصحیحین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: من اقتنی کلباً إلا کلب صید أو ماشیة أو زرع، نقص من أجره کل یوم قیراطان“ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5، صفحہ 225، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: شکار، حفاظت، کھیت یا جانوروں کی نگہداشت کے لیے کتے پالنا جائز ہے، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص کتا پالے، مگر وہ شکار، کھیت یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے ہو، تو اس کے اجر میں روزانہ دو قیراط کی کمی ہوگی“۔

طبی تحقیق کے لیے جانوروں کا استعمال:

طبی تحقیق کے مقاصد کے تحت جانوروں پر تجربات کرنا اس وقت جائز ہوگا جب:

۱- تجربات سے انسانی زندگی یا صحت کے لیے فائدہ متوقع ہو۔

۲- جانور کو غیر ضروری تکلیف نہ دی جائے۔

۳- تحقیق جائز ہو، ناجائز مقاصد یا ظلم پر مبنی نہ ہو۔

علامہ کمال الدین ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

”والحاصل أن کل ما کان فیه نفع مباح للإنسان، وکان بقدر الحاجة لا علی وجه الإفساد، فهو جائز، لقوله تعالی: وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ

فِيهَا دِفْئٌ وَمَنَافِعُ" (النحل:5)(فتح القدیر، جلد 5، صفحہ 486، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے لیے مباح فائدے کا باعث ہو اور ضرورت کے مطابق استعمال کی جائے، فساد کی صورت اختیار نہ کرے، تو وہ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور چوپایوں کو تمہارے لیے پیدا فرمایا، ان میں تمہارے لیے گرمی اور فائدے ہیں''۔

جانوروں کی نسل بچانے کے لیے طبی عمل:

اگر کسی جانور کی نسل کے ختم ہونے کا خطرہ ہو تو اس کی افزائش کے لیے طبی عمل (medical process) کرنا جائز ہے، بشرطیکہ:

۱-اس میں جانور کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

۲-نسل بچانے کی واقعی ضرورت ہو۔

۳-یہ عمل انسانی فائدے یا فطرت کے تحفظ کے لیے ہو۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"ولایجوز تعذیب الحیوان بغیر سبب معتبر شرعاً، فإن دعت الضرورۃ إلی شیء مباح، کان فعلہ جائزاً" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 474، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: کسی جانور کو بغیر کسی شرعی ضرورت کے اذیت دینا جائز نہیں، اور اگر کسی مباح ضرورت کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہو، تو یہ عمل جائز ہوگا۔

خلاصہ ونتیجہ:

حفاظتی مقاصد اور قانونی ضرورت کے تحت کتے اور دیگر جانوروں کی تربیت جائز ہے، بشرطیکہ وہ جائز مقصد کے لیے ہو۔

طبی تحقیق کے لیے جانوروں کا استعمال بھی جائز ہے اگر اس میں انسانی فائدہ ہو اور جانوروں کو غیر ضروری تکلیف نہ دی جائے۔

اگر کسی جانور کی نسل عنقا ہو رہی ہو تو اس کی افزائش اور تحفظ کے لیے میڈیکل پروسیس جائز ہے۔

شریعت کا اصل اصول یہ ہے کہ جانوروں کو غیر ضروری اذیت نہ دی جائے اور ان کا استعمال انسانی فائدے اور فطرت کے تحفظ کے لیے کیا جائے۔

آپریشن کی مشق اور دیگر ضرورتوں کے لئے جانوروں کے استعمال کا حکم

سوال: (8)

میڈیکل سسٹم میں آپریشن کی مشق، دواؤں کی ضرورت اور کاسمیٹک سامان بنانے کے لئے جانوروں کی حاجت ہوتی ہے، مذکورہ بالا مقاصد کے لئے ان جانوروں کی مصنوعی طور پر افزائش بھی کی جاتی ہے، اس پورے عمل میں جانوروں کے

حقوق کی رعایت مشکل ہوتی ہے، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: (8)

جانوروں کے ساتھ نرمی، رحم دلی اور ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول ہے۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں واضح ہدایات موجود ہیں کہ جانوروں پر ظلم نہ کیا جائے اور ان کی ضرورت کے بغیر اذیت دینا شرعاً ممنوع ہے۔

شرعی اصول اور دلائل:

۱- قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا" (سورۃ ہود:6)

ترجمہ: "زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے زندگی دی ہے اور ان کی ضروریات کی رعایت بھی فرمائی ہے۔

۲- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین فرمائی: مشہور حدیث ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِي هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا، فَلَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا وَلَا هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ" (صحیح بخاری:3318)

ترجمہ: ''ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب ہوا کہ اس نے اسے باندھ کر رکھا، نہ خود کھانے کو دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا سکے''۔

۳-فقہ حنفی کے اہم اصول:

فقہ حنفی میں جانوروں کے ساتھ بدسلوکی اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کو بنیاد بنا کر کئی احکام صادر کیے گئے ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں درج ہے:

''وَيُكْرَهُ أَنْ يُحَمِّلَ الدَّابَّةَ مَا لَا تُطِيقُهُ، وَيُكْرَهُ أَنْ يُجِيعَهَا أَوْ يُعَطِّشَهَا بِلَا ضَرُورَةٍ'' (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 357، مطبع مکتبہ رشیدیہ)

ترجمہ: یہ مکروہ ہے کہ جانور پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے یا بلاضرورت اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے''۔

بدائع الصنائع میں ذکر ہے:

''فَلَا يَجُوزُ التَّعَدِّي عَلَى الْحَيَوَانِ بِضَرْبٍ أَوْ أَذًى لَا ضَرُورَةَ فِيهِ''

(بدائع الصنائع، جلد 7، صفحہ 225، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: ''جانور کو بلاضرورت مارنا یا تکلیف دینا جائز نہیں ہے''۔

مذکورہ مسئلہ کی وضاحت:

۱-دواؤں کی ضرورت اور علاج کے لئے تجربہ:

جانوروں پر تجربہ کرنے کی اجازت اس وقت دی جائے گی جب:

انسانی زندگی کو لاحق خطرات سے بچانے کے لئے کوئی اور متبادل نہ ہو۔

تجربات میں جانوروں کو کم سے کم تکلیف دی جائے۔

ضرورت سے زیادہ جانوروں کا استعمال نہ کیا جائے۔

ان تجربات کا مقصد انسانی یا معاشرتی فلاح و بہبود ہو۔

۲-کاسمیٹک اشیاء کے لئے جانوروں کا استعمال:

کاسمیٹک یا زیب و زینت کے سامان کی تیاری کے لئے جانوروں پر تجربہ بلاضرورت کے دائرے میں آئے گا، کیونکہ ان کا مقصد انسانی جان بچانا یا صحت کو سنوارنا نہیں ہوتا۔اس لئے فقہ حنفی کے مطابق یہ عمل ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

۳-مصنوعی افزائش:(Artificial Breeding)

اگر جانوروں کی مصنوعی افزائش انسانی صحت یا علاج معالجے کے لئے ضروری ہو اور اس میں جانوروں کے حقوق کا حد درجہ خیال رکھا جائے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ ان جانوروں کو غیر ضروری اذیت نہ دی جائے۔

خلاصہ:

علاج و معالجہ اور دوا کی تیاری کے لئے جانوروں پر تجربات ضرورت کے تحت جائز ہوں گے، لیکن اس میں ان کے حقوق کی مکمل رعایت لازم ہے۔

کاسمیٹک اشیاء کے لئے جانوروں پر تجربہ شرعاً ناجائز ہے۔

مصنوعی افزائش کی اجازت مشروط ہے کہ اس میں جانوروں کی اذیت اور

تکلیف کوحتی الامکان کم کیا جائے۔

مصنوعی افزائش والے جانور کے گوشت ودودھ کے استعمال کا حکم

سوال:(9)

اگر تلقیح اور مصنوعی افزائش کے منفی اور مضر اثرات خود جانور، جنین اور اس کی نسل پر پڑتے ہوں، اس طرح اس انسان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہو جوان کا گوشت کھاتے یا دودھ پیتے ہوں اور طبی تحقیق سے اس کا ضرر رساں ہونا ثابت ہو جائے تو گوشت اور دودھ کے استعمال کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: (9)

اگر طبی تحقیق اور تجربات سے یہ ثابت ہو جائے کہ جانوروں کی مصنوعی افزائش اور تلقیح کے نتیجے میں ان کے گوشت اور دودھ میں ایسی مضر تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں، تو ایسی صورت میں ان کا استعمال ناجائز اور حرام ہوگا۔

شرعی اصول:

شریعت میں عمومی اصول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسانی صحت یا جسم کو ضرر پہنچائے، اس کا استعمال ممنوع اور ناجائز ہے۔قرآن مجید اور احادیث میں انسانی

جان کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے، اور نقصان دہ چیزوں سے بچنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی دلیل:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (البقرہ:195)

ترجمہ: اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

حدیث مبارک:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:2340)

ترجمہ: نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ۔

اس حدیث کی روشنی میں فقہاء کرام نے واضح کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے جسم یا صحت کو نقصان پہنچائے، اس کا استعمال ممنوع ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

۱- درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

"وَيَحْرُمُ كُلُّ مَضَرَّةٍ بِالْبَدَنِ أَوِ الْعَقْلِ أَوِ الدِّينِ أَوِ الْمَالِ" (درمختار مع ردالمحتار، ج5، ص289، مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: اور ہر وہ چیز حرام ہے جو بدن، عقل، دین یا مال کونقصان پہنچائے۔

۲-الفتاویٰ الہندیہ میں ہے:

"كُلُّ مَا أَضَرَّ بِالْبَدَنِ أَوْ أَدَّى إِلَى التَّهْلُكَةِ فَهُوَ مَمْنُوعٌ" (الفتاویٰ الہندیہ، ج5،ص360، مطبع دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو جسم کونقصان پہنچائے یا ہلاکت کا سبب بنے، وہ ممنوع ہے۔

۳-بدائع الصنائع میں ہے:

"وَإِذَا تَيَقَّنَ الضَّرَرُ مِنْ أَكْلِ الشَّيْءِ أَوْ شُرْبِهِ حَرُمَ اسْتِعْمَالُهُ" (بدائع الصنائع، ج1،ص179، مطبع دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: جب کسی چیز کے کھانے یا پینے سے نقصان یقینی ہو جائے تو اس کا استعمال حرام ہوجاتا ہے۔

خلاصہ:

اگر طبی تحقیق کے ذریعے یہ ثابت ہو جائے کہ جانوروں کی مصنوعی افزائش اور تلقیح کے مضر اثرات جانور، جنین اور نسل پر پڑتے ہیں، اور انسانوں کے لیے بھی ان کا دودھ یا گوشت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، تو ایسے جانوروں کا گوشت کھانا اور دودھ پینا ناجائز اور حرام ہوگا۔ کیونکہ انسانی صحت کا تحفظ شریعت کی نظر میں لازم ہے اور نقصان دہ اشیاء کا استعمال ممنوع ہے۔

حلال جانور اور شوقیہ جانور کی مصنوعی افزائش کا حکم

سوال:(10)

حلال جانور جن کے گوشت، دودھ اور انڈے سے انتفاع کیا جاتا ہے اور وہ جانور جن کو محض شوق کی تکمیل یا حفاظتی مقصد سے پالا جاتا ہے، کیا دونوں کی مصنوعی افزائش میں کوئی فرق ہوگا؟ یا دونوں کا حکم یکساں ہوگا؟

جواب:(10)

مصنوعی افزائش کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت نے جانوروں کی نگہداشت اور ان کے استعمال کے مقاصد کو اہمیت دی ہے۔شریعت میں ’مصالح‘‘ اور’’مقاصد‘‘ کو مدنظر رکھ کر احکام مرتب کیے جاتے ہیں۔جانوروں کی مصنوعی افزائش میں اگر جائز مقاصد، جیسے گوشت، دودھ، انڈے یا جائز منافع حاصل کرنا شامل ہو تو یہ جائز ہے،لیکن اگر غیر ضروری،فضول خرچی یا محض تفریح کے لیے ہوتو اس میں کراہت یا حرمت آسکتی ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی کے اصولوں میں مصالح مرسلہ اور عرف کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔یہاں مسئلہ’’حلال جانوروں‘‘ کی مصنوعی افزائش کا ہے:

۱-اگر جانور کا گوشت، دودھ یا انڈے کی نیت سے افزائش ہو۔

یہ جائز ہے کیونکہ شریعت نے ان چیزوں سے انتفاع کو مباح قرار دیا ہے، بلکہ یہ انسانی ضرورت بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ" (سورۃ النحل:5)

ترجمہ: اور جانوروں کو پیدا کیا، ان میں تمہارے لیے گرمی (کا سامان) اور فائدے ہیں اور انہی میں سے تم کھاتے ہو۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"الأصل فی المنافع المباحة فی الأعیان الحل والإباحة ما لم یرد نص بالمنع" (المبسوط، جلد 12، صفحہ 64، مطبع دار المعرفۃ)

ترجمہ: اصل یہ ہے کہ مباح فوائد میں اشیاء کا حکم جواز اور اباحت کا ہے جب تک کوئی ممانعت کی دلیل موجود نہ ہو۔

۲-اگر جانور محض شوق یا حفاظت کے لیے پالا جائے۔

یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں کوئی غیر شرعی عمل یا اسراف نہ ہو۔

علامہ ابن نجیم حنفیؒ فرماتے ہیں:

"الأصل فی الأشیاء الإباحة ما لم یقم دلیل علی التحریم"
(البحر الرائق، جلد 8، صفحہ 190، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اصل یہ ہے کہ چیزوں میں اباحت (جائز ہونا) ہے جب تک حرمت

پرکوئی دلیل قائم نہ ہو۔

مصنوعی افزائش میں فرق کا بیان:

اب سوال یہ ہے کہ حلال جانوروں کی مصنوعی افزائش (جن سے فائدہ لیا جاتا ہے) اورشوقیہ یا حفاظتی جانوروں کی افزائش میں کیا فرق ہے؟

فقہ حنفی میں اس حوالے سے درج ذیل اصول واضح ہوتا ہے:

۱-مصنوعی افزائش کا مقصد اگر مباح و جائز ہو، جیسے دودھ، گوشت، انڈے کے لیے افزائش، تو یہ جائز ہے۔

۲-شوقیہ یا حفاظتی جانوروں کی افزائش بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف نہ ہواور شریعت کی حدود کی خلاف ورزی نہ ہو۔

حضرت مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں:

"**إذا كان في تربية الحيوان منفعة معتبرة شرعًا أو عادةً، فهي مباحة وجائزة، وإن لم يكن فيها منفعة معتبرة بل مجرد تضييع المال والوقت، فهي داخلة في الإسراف المنهي عنه**" (جواہر الفقہ ،جلد 2،صفحہ 251،مطبع دارالافتاء)

ترجمہ: جب جانور کی افزائش میں کوئی شرعی یا عرفی منفعت ہوتو یہ جائز ہے، اور اگر فائدہ نہ ہو بلکہ محض مال اور وقت کا ضیاع ہوتو یہ اسراف میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

نتیجہ:

۱-حلال جانور جن سے گوشت، دودھ یا انڈے کی نیت سے مصنوعی افزائش کی جاتی ہے، یہ جائز اور شرعاً مطلوب بھی ہوسکتی ہے۔

۲-اگر جانور محض شوق یا حفاظت کی غرض سے پالا جائے اور اس میں غیر ضروری اسراف نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے۔

۳-دونوں صورتوں کا حکم عمومی طور پر یکساں ہے، البتہ نیت اور مقصد کی بنیاد پر فرق پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر افزائش کا مقصد غیر ضروری ہو یا فضول خرچی پر مبنی ہو تو یہ قابلِ کراہت ہوسکتی ہے۔

موجودہ دور میں فسق سے مراد اور اس پر مرتب ہونے والے احکام

فسق کی تعریف

سوال:(1)

کیا فسق کی کوئی متعین تعریف ہے؟ یا فسق کا اطلاق ہر زمانہ کے عرف اور اخلاقی حالات پر موقوف ہے؟

جواب:(1)

فسق کی تعریف اور اس پر احکام کے متعلق اسلامی شریعت اور فقہ حنفی میں واضح رہنمائی موجود ہے۔

فسق کی تعریف:

فقہائے کرام اور مفسرین نے فسق کو ایسا عمل قرار دیا ہے جو شریعت کی حدود سے خروج اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے زمرے میں آتا ہے۔ ''فسق'' کے لغوی معنی ''نکل جانا'' ہیں، اور اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کہ انسان ایمان کو ختم کیے

بغیر حدودِ شریعت سے تجاوز کرے۔

حضرت امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

"الفسق: هو الخروجُ عن الطاعةِ، وهو يقعُ على وجهين: أحدهما في كفر، والثاني في معصية غير كفر" (المفردات فی غریب القرآن، صفحہ ۶۳۷، دارالقلم)

یعنی فسق طاعت سے نکل جانے کو کہتے ہیں، جو دو قسموں پر مشتمل ہے: ایک کفر کے ساتھ اور دوسرا معصیت میں جو کفر نہیں ہے۔

فقہ حنفی میں فسق کی وضاحت:

فقہ حنفی میں فسق کی تعریف زیادہ تر معصیتِ کبیرہ (بغیر توبہ) اور اصرار علی الصغیرہ (چھوٹے گناہوں پر اصرار) پر کی گئی ہے۔

امام علاء الدین کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"الفاسق هو من أتى بالكبيرة ولم يتب منها أو أصر على الصغيرة"

(بدائع الصنائع، جلد ۱، صفحہ ۲۲۹، دارالکتب العلمیۃ)

یعنی فاسق وہ ہے جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو اور اس سے توبہ نہ کرے یا صغیرہ گناہوں پر اصرار کرے۔

عرف اور اخلاقی حالات کے اثرات:

فسق کا اطلاق ہر زمانے کے عرف اور اخلاقی حالات پر موقوف نہیں بلکہ یہ

قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے اصولوں پر مبنی ہے۔کسی چیز کو فاسقانہ قرار دینے کے لیے شرعی نصوص کا اعتبار ہوگا، نہ کہ عرف کا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

"**وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ**" (سورہ البقرہ، آیت:229)

جو شخص اللہ کی حدود کو تجاوز کرتا ہے وہ ظالم (فاسق) ہے۔

فسق کے احکام:

۱- گواہی:

فاسق کی گواہی نا قابل قبول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"**وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ**" (سورہ الطلاق، آیت:2)

یعنی گواہی کے لیے عدل (نیک اور پرہیزگار) شخص کو پیش کرو۔

۲- امامت:

فاسق شخص کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"**تكره إمامة الفاسق**" (ردالمحتار، جلد ۱، صفحہ 563، دار الفکر)

۳-معاملات اور معاشرت:

فاسق کے ساتھ معاملات اور تعلقات میں احتیاط لازم ہے تاکہ اس کی برائی کا اثر نہ ہو۔

نتیجہ:

فسق کی کوئی عرفی یا زمانی تعریف نہیں بلکہ یہ ہمیشہ قرآن وسنت اور فقہ کے اصولوں پر موقوف ہے۔شریعت نے فسق کو معصیتِ کبیرہ یا اصرار علی الصغیرہ سے جوڑا ہے اور اس پر احکام بھی واضح طور پر بیان کیے ہیں۔

عبادات ومعاملات میں فاسق پر مرتب ہونے والے احکام

سوال:(2)

موجودہ حالات میں عبادات، معاملات وغیرہ میں فسق وفاسق پر کون کون سے احکام مرتب ہو سکتے ہیں؟

جواب:(2)

فسق اور فاسق سے متعلق اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کی تعلیمات واضح ہیں کہ ان پر عبادات، معاملات، اور دیگر شرعی احکام کے کئی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فسق سے مراد ایسا گناہ کبیرہ ہے جو توبہ کیے بغیر مسلسل کیا جائے یا گناہ صغیرہ کا اصرار

ہو۔فاسق وہ شخص ہے جو فسق کا مرتکب ہو اور اس پر اصرار کرے۔فقہ حنفی میں فسق کی حالت میں درج ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں:

ا-عبادات کے متعلق احکام:

فاسق شخص کی عبادات، جیسے نماز، روزہ وغیرہ، اپنی جگہ درست ہوں گی بشرطیکہ وہ شرائط وارکان کے مطابق ادا کی جائیں، لیکن اس کی عبادات کی قبولیت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔اگرچہ ظاہری طور پر نماز وغیرہ درست شمار کی جائے گی، لیکن فاسق کی امامت میں نماز باجماعت مکروہ تحریمی ہے۔

حوالہ:

امام ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تکرہ إمامة الفاسق لأنه غير مرضى الدين، والصلاة خلفه مكروهة" (فتح القدیر، جلد 1، صفحہ 246، مطبع دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: فاسق کی امامت مکروہ ہے، کیونکہ وہ دین کے اعتبار سے پسندیدہ نہیں، اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے"۔

٢-معاملات کے متعلق احکام:

فاسق کے ساتھ معاملات جائز ہیں، لیکن احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کی گواہی عدالت میں معتبر نہیں ہوگی، اور اس کے ساتھ بعض قسم کے عقود میں احتیاط کرنا

ضروری ہے،مثلاً نکاح،شہادت،وغیرہ۔

حوالہ:

امام سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولا تقبل شهادة الفاسق لأنه غير عدل، وقد قال الله تعالىٰ: (وأشهدوا ذوی عدل منكم)" (المبسوط،جلد16،صفحہ 104،مطبع دارالمعرفہ،بیروت)

ترجمہ:"فاسق کی گواہی قبول نہیں، کیونکہ وہ عادل نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اور عادل لوگوں کو گواہ بناؤ)"۔

۳-معاشرتی اور سماجی احکام:

فاسق شخص کے ساتھ دوستانہ اور قریبی تعلقات سے اجتناب کرنا چاہیے، لیکن اصلاح کی نیت سے اس کو نصیحت اور دعوت دینا واجب ہے۔اس کے جنازے میں شرکت مکروہ نہیں،لیکن ایسے شخص کو معاشرتی عہدے دینا ممنوع ہے۔

حوالہ:

علامہ علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا ينبغي تقليد الفاسق مناصب الولاية والإمامة، لأنه غير أمين على أمور المسلمين" (بدائع الصنائع،جلد7،صفحہ 134،مطبع دارالکتب العلمیہ ،بیروت)

ترجمہ:"فاسق کو قیادت اور امامت کے عہدے دینا مناسب نہیں، کیونکہ وہ

مسلمانوں کے معاملات پر امانت دار نہیں ہوتا''۔

خلاصہ:

فسق کے احکام عبادات میں امامت کی کراہت، معاملات میں گواہی کے عدم قبولیت، اور معاشرتی ذمہ داریوں میں عہدوں سے محرومی پر مشتمل ہیں۔ البتہ ان احکام کے نفاذ میں فاسق کی اصلاح اور اسے توبہ کی ترغیب دینا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح راستے پر لوٹ آئے۔

داڑھی نہ رکھنے والے کی شہادت کا حکم

سوال:(3)

جو لوگ داڑھی نہیں رکھتے ہوں؛ لیکن نماز روزہ کے پابند ہوں، کیا رؤیت ہلال کے سلسلہ میں یا اختلافی معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے؟

جواب:(3)

اسلامی شریعت میں شہادت قبول کرنے کے لیے گواہ کا عادل اور دیندار ہونا ضروری ہے۔ عادل وہ شخص ہوتا ہے جو کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو، اور عام حالات میں شریعت کے ظاہری اور باطنی احکام کی پابندی کرتا ہو۔ داڑھی رکھنا سنتِ مؤکدہ ہے اور فقہائے کرام کے نزدیک ایک مشت داڑھی رکھنا

واجب ہے۔داڑھی مونڈنا یا ایک مشت سے کم رکھنا معصیت کے زمرے میں آتا ہے۔
لہٰذا فقہ حنفی کے اصول کے مطابق جو شخص داڑھی نہ رکھے، وہ فاسق شمار ہوگا،
اور فاسق کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔لیکن اگر ایسا شخص دیگر دینی اعمال کا پابند ہو،
جیسے نماز اور روزہ، تو اختلافی معاملات میں یا رؤیتِ ہلال کی شہادت میں اس کی گواہی
پر انفرادی طور پر اعتبار نہیں کیا جائے گا جب تک کہ دیگر شرائط پوری نہ ہوں اور کوئی
عادل گواہ موجود نہ ہو۔

مستند حوالہ جات:

۱-امام ابنِ عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"والعدل هو المسلم البالغ العاقل الذی لم یرتکب کبیرة ولم یصر علی صغیرة" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 351، مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: عادل وہ مسلمان ہے جو بالغ، عاقل ہو، کبیرہ گناہ نہ کرتا ہو اور صغیرہ
گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔

۲-علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

"ویشترط العدالة فی الشهادة، وهی اجتناب الکبائر وعدم الإصرار علی الصغائر" (الدر المختار مع ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 347، مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: شہادت کے لیے عادل ہونا شرط ہے، اور عدل کا مطلب ہے کبیرہ
گناہوں سے بچنا اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرنا۔

۳- شیخ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

”ومن ارتکب معصیة کالإصرار علی حلق اللحیة لا یقبل قوله“

(البحر الرائق، جلد 7، صفحہ 117، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: جو شخص معصیت کا مرتکب ہو، جیسے داڑھی مونڈنے پر اصرار کرے، اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

خلاصہ:

اگر کوئی شخص داڑھی نہیں رکھتا اور دیگر شرعی واجبات کا پابند ہے، تو شریعت کے اصول کے مطابق وہ عادل نہیں کہلائے گا اور اس کی شہادت رؤیتِ ہلال یا دیگر اختلافی معاملات میں قبول نہیں ہوگی، الا یہ کہ کوئی اور عادل گواہ موجود نہ ہو یا کوئی خاص ضرورت درپیش ہو۔

فاسق کو مذہبی اداروں کا ذمہ دار بنانے کا حکم

سوال: (4)

عام طور پر ایسے لوگوں کو بھی مساجد کا یا مذہبی اداروں اور تنظیموں کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے، جو قدیم فقہاء کے بیان کے مطابق وجودِ فسق سے خالی نہیں ہوتے ہیں، تو کیا ان کا حکم ان اداروں کے خادمین یا تنظیم کے افراد کے لئے واجب الاطاعت ہوگا؟

جواب:(4)

فقہ اسلامی کے اصولوں کی روشنی میں ایسے شخص کو دینی ادارے یا تنظیم کا ذمہ دار بنانا جس کے فسق کا وجود پایا جاتا ہو، ایک نہایت حساس اور اہم مسئلہ ہے۔ شریعت نے قیادت اور ذمہ داری کے منصب کے لیے تقویٰ، دیانتداری اور اہلیت کو بنیادی شرائط قرار دیا ہے۔ فسق کے ساتھ قیادت اور ذمہ داری کی ادائیگی نہ صرف اس فرد کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ ادارے اور تنظیم کے نظام پر بھی منفی اثر ڈال سکتی ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں قیادت کے اصول:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا" (سورۃ النساء:58)

ترجمہ: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إذا ضيعت الأمانة فانتظر الساعة، قيل: وكيف إضاعتها؟ قال: إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة" (صحیح بخاری، حدیث نمبر:6496)

ترجمہ: جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ صحابہ نے پوچھا: امانت کیسے ضائع ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب معاملات نا اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔

فقہ حنفی میں قیادت اور اطاعت کا اصول:

فقہاء احناف کے نزدیک، ایسے افراد جو فسق میں مبتلا ہوں، انہیں قیادت یا کسی دینی منصب پر فائز کرنا درست نہیں، کیونکہ وہ شرعی اصولوں کی پاسداری کے اہل نہیں ہوتے۔علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولا يجوز نصب الفاسق قاضياً ولا إماماً ولا متولياً للأوقاف، لأن ذلك يؤدي إلى الفساد وتعطيل الأحكام الشرعية" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 416، مطبع: دارالفکر)

ترجمہ: فاسق کو قاضی، امام یا اوقاف کے متولی کے طور پر مقرر کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس سے فساد اور احکام شرعیہ کی تعطیل لازم آتی ہے۔

خادمین اور عوام کے لیے حکم:

ایسے ذمہ دار کی اطاعت جس کے بارے میں فسق معلوم ہو، واجب الاطاعت نہیں ہوگی۔فقہاء نے واضح کیا ہے کہ فسق قیادت کے اوصاف کے خلاف ہے، جیسا کہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الفسق مانع من الولاية والإمامة، لأن الفاسق لا يوثق به في أمر الدين" (الھدایہ، جلد 1، صفحہ 128، مطبع: داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ: فسق ولایت اور امامت سے مانع ہے، کیونکہ فاسق پر دینی معاملات میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصہ:

۱-کسی فاسق کو مذہبی ادارے یا تنظیم کی ذمہ داری دینا شرعاً مناسب نہیں۔

۲-عوام اور خادمین کے لیے ایسے فاسق ذمہ دار کی اطاعت واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس کی قیادت شریعت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

۳- ذمہ داری اور قیادت کے لیے تقویٰ، دیانت اور اہلیت کو ترجیح دینا ضروری ہے تاکہ ادارے کے مقاصد صحیح طور پر پورے ہوں۔

فسق فی العقیدہ سے کیا مراد ہے؟

سوال:(5)

فسق فی العقیدہ سے کیا مراد ہے؟ اور جو لوگ اعتقادی اعتبار سے فاسق ہوں، ان کے لئے کیا احکام ہیں؟

جواب:(5)

فسق فی العقیدہ کی تعریف:

فقہ اسلامی میں ''فسق'' کا مطلب شریعت کے احکام کی مخالفت یا معصیت میں مبتلا ہونا ہے۔ ''فسق فی العقیدہ'' سے مراد وہ شخص ہے جو بنیادی اسلامی عقائد میں انحراف کرے، مثلاً توحید، رسالت، آخرت، یا دیگر ضروریات دین میں کجی اختیار

کرے، لیکن ایسا انحراف جو کفر تک نہ پہنچے۔

ایسا شخص کافر نہیں کہلائے گا، لیکن فاسق اور گمراہ قرار دیا جائے گا۔ یہ وہ حالت ہے جو کفر سے کم درجے پر ہوتی ہے، لیکن معصیت اور بدعقیدگی کی وجہ سے خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

اعتقادی فاسق کے احکام:

۱-اعتقادی فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، خاص طور پر اگر وہ اپنے فسق اور گمراہی کو ظاہر کرتا ہو۔

۲-فاسق کے ساتھ دوستی اور محبت رکھنا جائز نہیں، لیکن اس کی اصلاح کی کوشش کرنا دینی فریضہ ہے۔

۳-اگر فسق فی العقیدہ کفر کی حد کو پہنچ جائے تو اس سے نکاح برقرار نہیں رہتا، اور تجدید ایمان کے بغیر اس سے تعلقات جائز نہیں ہوتے۔

۴-ایسا شخص اسلامی معاشرے میں قابل اعتبار نہیں ہوتا اور اس کی گواہی عدالت میں قبول نہیں کی جاتی۔

دلائل از کتب فقہ:

۱-فتح القدیر:

امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

"والفسق ما یخرج صاحبہ من الطاعۃ الی المعصیۃ، سواء کان فی

العقائد أو فی الأفعال، ولا یکون کفرًا إلا إذا کان مناقضًا لأصل من أصول الدین" (فتح القدیر، ج1،ص92،مطبع دارالفکر،بیروت)

ترجمہ:''فسق وہ ہے جو بندے کو اطاعت سے نکال کر معصیت میں ڈال دے، خواہ یہ عقائد میں ہو یا اعمال میں، لیکن یہ کفر اسی وقت ہوگا جب دین کے کسی اصول کے خلاف ہو''۔

۲-بدائع الصنائع:

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"**والمبتدع الفاسق فی عقیدته إن کان فسقه یتنافی مع أحکام الإسلام، کأهل البدع الغالیة، لا تصح صلاته بالناس، لأنه لا یأمن اقتداء الناس ببدعته**" (بدائع الصنائع،ج1،ص250،مطبع دارالکتب العلمیۃ،بیروت)

ترجمہ:''جو شخص عقیدے میں فاسق ہو اور اس کا فسق اسلام کے احکام کے خلاف ہو، جیسے غالی بدعتی، تو اس کے پیچھے نماز درست نہیں کیونکہ اس کی بدعت کی پیروی کا اندیشہ ہوتا ہے''۔

۳-ردالمحتار:

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"**إذا کان الإمام فاسقًا فی الاعتقاد، وکان فسقه غیر مخرج عن الملة، فإن إمامته مکروهة تحریمًا، لأنه غیر مرضی فی دینه**" (ردالمحتار،ج1،ص

560، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: ''اگر امام اعتقاد میں فاسق ہو، اور اس کا فسق کفر تک نہ پہنچے تو اس کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی کیونکہ وہ اپنے دین میں غیر معتبر ہے''۔

خلاصہ:

فسق فی العقیدہ ایک ایسا انحراف ہے جو دین کے ضروری عقائد سے جزوی طور پر منحرف ہو، لیکن اس حد تک نہیں کہ انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے۔ ایسے افراد کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے، ان سے گہرے تعلقات سے گریز کرنا ضروری ہے، اور ان کی اصلاح کے لئے دینی تعلیمات کے ذریعے محنت کرنی چاہیے۔

فاسق کی صرف زبان سے توبہ کا حکم

سوال:(6)

اگر فاسق شخص زبان سے توبہ کر لے، لیکن وہ ابھی اس توبہ کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوا ہے تو کیا اس کی توبہ دنیوی احکام کے اعتبار سے قابل قبول ہوگی؟

جواب:(6)

فاسق شخص اگر زبانی طور پر توبہ کر لے لیکن اپنے عمل میں اس پر کاربند نہ ہو تو

دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کی توبہ اس وقت تک معتبر مانی جائے گی جب تک وہ دوبارہ ظاہری طور پر گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔ اسلامی شریعت میں توبہ کے صحیح ہونے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ بندہ اپنے گناہ پر نادم ہو، آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم کرے اور اگر اس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو ان حقوق کو ادا کرے یا معاف کروالے۔

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق، دنیوی احکام کا دارومدار ظاہر پر ہے، اور توبہ کا معاملہ دل اور نیت سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص زبان سے توبہ کرے اور ظاہری طور پر اپنے گناہ کے عمل سے باز رہے، تو شریعت اس کی توبہ کو دنیا میں معتبر مانتی ہے۔ البتہ، اخروی اعتبار سے اس کی توبہ اسی وقت مقبول ہوگی جب وہ دل سے حقیقی طور پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے گناہ ترک کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔

مستند کتب کے حوالہ جات:

ا-الدرالمختار مع ردالمحتار:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والتوبة عبارة عن الندم على ما مضى والعزم على أن لا يعود إليه واشتراط الإقلاع عنه في الحال فيما يتعلق بحقوق العباد" (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، صفحہ 242، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: توبہ اس ندامت کو کہتے ہیں جو گزرے ہوئے گناہ پر ہو، اور آئندہ

اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم ہو، نیز جو گناہ حقوق العباد سے متعلق ہو اس پر موجودہ وقت میں باز آنا ضروری ہے۔

۲-فتح القدیر:

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وحقيقة التوبة هى الرجوع عن المعصية بالندم على فعلها والعزم على ترك العود فيها فى المستقبل" (فتح القدیر، جلد 4، صفحہ 361، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ سے ندامت کے ساتھ باز آ جائے اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم کرے۔

۳-احیاء علوم الدین:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التوبة حقيقةً هى الندم مع ترك المعصية حالاً وعزم على أن لايعود إليها" (احیاء علوم الدین، جلد 4، صفحہ 6، مطبع: دار المعرفۃ، بیروت)

ترجمہ: توبہ حقیقت میں ندامت ہے، موجودہ وقت میں گناہ کو ترک کرنا اور آئندہ اس کی طرف واپس نہ لوٹنے کا عزم ہے۔

نتیجہ:

دنیوی احکام کے اعتبار سے زبانی توبہ کو معتبر مانا جائے گا، بشرطیکہ وہ شخص

ظاہری طور پر گناہ سے باز رہے۔ تاہم، اخروی نجات کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل سے نادم ہو اور توبہ کے تقاضوں پر عمل کرے۔

بعض عرب علماء داڑھی کو سنن عادیہ سمجھتے ہیں، ان کی اس سمجھ کا حکم

سوال: (7)

بعض مسائل میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، جیسے: بعض عرب ملکوں میں داڑھی کو سنن عادیہ میں شمار کیا جاتا ہے؛ اور بہت سے اہل علم اس کے قائل ہیں، اسی طرح بہت سے اہل علم داڑھی میں کسی خاص مقدار کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، اور ان کا یہی مسلک ہے، اگر وہ داڑھی نہیں رکھیں یا بہت چھوٹی رکھیں تو کیا ان کو فاسق سمجھا جائے گا؟

جواب: (7)

داڑھی کو شریعت اسلامیہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کی بڑھانے کی تاکید متعدد احادیث میں موجود ہے۔ فقہ حنفی میں داڑھی کا ایک مشت سے کم رکھنا مکروہِ تحریمی اور ناجائز قرار دیا گیا ہے، اور ایک مشت سے کم رکھنے والا گناہگار اور فاسق شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ اس مسئلے میں بعض دیگر مکاتب فکر میں نرمی اور اختلاف پایا جاتا ہے، جیسا کہ بعض اہلِ علم داڑھی کو ''سنتِ عادیہ'' میں شمار کرتے ہیں یا اس کی خاص مقدار کو ضروری نہیں سمجھتے۔

دلائل از فقہ حنفی:

۱-حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَعْفُوا اللِّحى وَحُفُّوا الشَّوَارِبَ" (بخاری، حدیث نمبر:5892، مسلم، حدیث نمبر:259)

ترجمہ:"داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹواؤ"۔

یہ حدیث فقہ حنفی کی بنیاد ہے کہ داڑھی کو ایک مشت تک بڑھانا واجب ہے، اور اس سے کم رکھنا مکروہِ تحریمی ہے۔

۲-امام طحاوی کی روایت:

امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"كَانَ السَّلَفُ يَأْخُذُونَ مِنْ طُولِ لِحَاهُمْ وَيَسْتَحْسِنُونَ ذَلِكَ"

(شرح معانی الآثار، ج4، ص230، مطبع: دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ:"سلف صالحین اپنی داڑھی کو ایک مشت سے زائد کاٹتے تھے اور یہی ان کے نزدیک مستحسن تھا"۔

۳-فتاویٰ عالمگیری:

"وَيُكْرَهُ تَحْرِيماً التَّحْرِيمًا قَصُّ اللِّحْيَةِ دُونَ قَبْضَةٍ" (فتاویٰ عالمگیری، ج5، ص358، مطبع: دار الفکر)

ترجمہ:"داڑھی کو ایک مشت سے کم کرنا مکروہِ تحریمی ہے"۔

فقہ حنفی کے مطابق حکم:

فقہ حنفی میں ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس سے کم کرنا ناجائز ہے۔ جو لوگ داڑھی نہیں رکھتے یا ایک مشت سے کم رکھتے ہیں، ان کو فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق فاسق کہا جائے گا، کیونکہ یہ حکم صریح ہے۔

اختلافِ رائے کا احترام:

بعض مکاتبِ فکر میں داڑھی کی مقدار کے متعلق مختلف آراء پائی جاتی ہیں، اور وہ اسے سنتِ عادیہ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق گناہگار نہیں کہا جاسکتا، البتہ فقہ حنفی کے پیروکاروں کے لیے اس حکم کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق داڑھی کا ایک مشت رکھنا واجب ہے، اور اس سے کم کرنا گناہ ہے، اس لیے ایسا شخص فاسق ہوگا۔ تاہم اختلاف رکھنے والے دیگر اہلِ علم کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والا فاسق ہے یا نہیں؟

سوال:(8)

داڑھی کا ثبوت قران پاک سے ہے یا صرف حدیث سے ہے؟ اور جتنے

انبیاء آئے انہوں نے ڈاڑھی رکھی ان کی داڑھی کی مقدار کتنی تھی؟ اور حضرات صحابہ وتابعین اور حضرات ائمہ اور محدثین کی داڑھی کی مقدار کتنی تھی؟ جو لوگ ایک مشت سے کم داڑھی رکھتے ہیں وہ داڑھی میں داخل ہے یا نہیں؟ کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی امام نے ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے کی اجازت دی ہے؟ جو لوگ اس کو سنن عادیہ کہتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ اور جو لوگ ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھتے ہیں ان کو شرعی اعتبار سے فاسق کہنا درست ہے یا نہیں؟

جواب:(8)

داڑھی کا حکم اور مقدار کے متعلق سوالات کے جوابات:

ا- داڑھی کا ثبوت قرآن وحدیث سے:

داڑھی رکھنے کا حکم قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔قرآن مجید میں اگرچہ صریح حکم موجود نہیں، لیکن مختلف آیات میں اللہ کے نبیوں کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے داڑھی رکھی۔مثلاً:

"قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي" (سورۃ طٰہٰ :94)

ترجمہ:"ھارون نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے ! میری داڑھی اور میرے سر کے بال کو نہ پکڑو"۔

یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی کا ذکر موجود ہے، جو داڑھی رکھنے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

حدیث شریف میں واضح طور پر داڑھی رکھنے کا حکم ہے:

" عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خالفوا المشرکین، وفروا اللحی وأحفوا الشوارب" (صحیح البخاری: 5892، صحیح مسلم:259)

ترجمہ:''ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:مشرکوں کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ''۔

۲-انبیاء کی داڑھی کی مقدار:

تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے داڑھی رکھی، کیونکہ داڑھی مردوں کے لیے فطری زینت ہے اور شریعت میں اس کا اہتمام رہا ہے۔انبیاء کی داڑھی کی مقدار کے بارے میں صریحاً کوئی روایت موجود نہیں،لیکن عام طور پر ان کی داڑھی مبارک گھنی اور طبعی حالت میں تھی،جس میں تراش خراش کا ذکر نہیں آتا۔

۳-صحابہ،تابعین،ائمہ اور محدثین کی داڑھی کی مقدار:

صحابہ کرام، تابعین، اور ائمہ و محدثین کی داڑھی کم از کم ایک مشت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے موقع پر ایک مشت سے زائد داڑھی کاٹ دیتے تھے:

''کان ابن عمر إذا حج أو اعتمر قبض علی لحیتہ فما فضل أخذہ''

(صحیح البخاری:5893)

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی کو ایک مشت پکڑتے،اوراس سے زائد حصہ کاٹ دیتے''۔

۴-ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے کا حکم:

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنا خلافِ سنت اور ناجائز ہے۔تمام ائمہ اربعہ کے نزدیک ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے، اور اس سے کم داڑھی رکھنا کسی بھی امام کے نزدیک جائز نہیں۔

۵-ائمہ اربعہ کی رائے:

ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کے نزدیک داڑھی رکھنا واجب ہےاوراس کی مقدار کم از کم ایک مشت ہونا ضروری ہے:

حنفیہ:

امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مشت سے کم داڑھی رکھنا حرام ہے۔(فتح الباری،ج10،ص350،مطبع دارالمعرفۃ)

مالکیہ:

امام مالکؒ کے نزدیک داڑھی کا مونڈنا یا ایک مشت سے کم رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔(الذخیرہ للقرافی، ج13،ص277،دارالغرب الاسلامی)

شافعیہ:

امام شافعیؒ نے بھی داڑھی بڑھانے کو سنتِ موکدہ کہا ہے۔ (المجموع، ج 1، ص 340، دار الفکر)

حنابلہ:

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک داڑھی مونڈنا یا کاٹنا حرام ہے۔ (المغنی لابن قدامہ، ج 1، ص 65، دار ہجر)

۶ - سنن عادیہ کا مطلب:

جو لوگ داڑھی کو "سنن عادیہ" کہتے ہیں، وہ غلط تعبیر کرتے ہیں۔ "سنن عادیہ" ان افعال کو کہتے ہیں جو کسی عادت یا طبیعت کے مطابق ہوں، جبکہ داڑھی کا تعلق شرعی احکام سے ہے اور یہ "سنن ہدیٰ" میں شامل ہے، یعنی ان امور میں سے ہے جن پر عمل کرنا دین کا حصہ ہے۔

۷ - ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والوں کو فاسق کہنا:

علماء کے نزدیک ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کو فاسق کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ ایک واجب حکم کو ترک کرتا ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق ایسے شخص کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔

"قال ابن عابدين: حلق اللحية حرام عندنا و كذا قصها إذا لم تبلغ حد القبضة" (ردالمحتار، ج2،ص418،دارالفکر)

ترجمہ:"ہمارے نزدیک داڑھی مونڈنا حرام ہے اور ایک مشت سے کم کرنا بھی ناجائز ہے"۔

نتیجہ:

داڑھی رکھنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اور تمام انبیاء، صحابہ، تابعین، ائمہ اور محدثین نے اس پر عمل کیا۔ داڑھی کی کم ازکم مقدار ایک مشت ہے، اور اس سے کم داڑھی رکھنا جائز نہیں۔ ایسے افراد کو شرعی لحاظ سے فاسق کہا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

عوامی مقامات پر نماز کا مسئلہ

نماز کیسی جگہ پر ادا کی جائے؟

سوال:(1)

نماز کے لئے زمین کی بابت ارض غیر اور ارض مغصوبہ اور حکومت کے زیر ملکیت زمین میں فرق ہوگا یا ان سب کا حکم یکساں ہوگا؟

جواب:(1)

نماز کے لیے زمین کے احکام کا تعلق اس کی ملکیت اور استعمال کے جائز ہونے سے ہے۔ شریعت اسلامیہ میں زمین کی مختلف اقسام، مثلاً ارضِ غیر، ارضِ مغصوبہ، اور حکومت کے زیرِ ملکیت زمین کے بارے میں واضح احکام ہیں۔ ان میں فرق سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے مطابق نماز کے جواز اور عدم جواز کا حکم بدلتا ہے۔

1-ارض غیر (کسی کی نجی ملکیت میں زمین):

اگر زمین کسی دوسرے کی ملکیت ہو اور مالک کی اجازت کے بغیر وہاں نماز پڑھی جائے تو یہ مکروہ ہے، لیکن نماز ادا ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر قبضہ ناجائز نہیں کیا گیا بلکہ اجازت طلب کیے بغیر استعمال کیا گیا ہے۔

فقہ حنفی کی دلیل:

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"ولا تصح الصلاۃ فی مکان مغصوب، ولو غصب فرشا وصلی علیہ أثم وصحت" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج1،ص651، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: ''مغصوب زمین میں نماز ادا کرنا جائز نہیں، لیکن اگر کسی نے فرش یا زمین غصب کر کے اس پر نماز پڑھی تو گناہگار ہوگا لیکن نماز صحیح ہوگی''۔

۲-ارض مغصوبہ (زبردستی قبضہ کی گئی زمین):

مغصوب زمین میں نماز پڑھنا ناجائز اور مکروہِ تحریمی ہے، کیونکہ غصب کرنا حرام ہے اور اس میں نماز پڑھنا گناہ کو مزید بڑھانے کے مترادف ہے۔

فقہ حنفی کی دلیل:

علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

"الصلاۃ فی الأرض المغصوبۃ مکروھۃ تحریماً" (الھدایۃ شرح البدایۃ، ج1،ص128، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: ''مغصوب زمین میں نماز مکروہ تحریمی ہے''۔

۳-حکومت کے زیرِ ملکیت زمین:

حکومت کی زمین عام طور پر عوام کی سہولت کے لیے وقف ہوتی ہے، جیسے

پارک، سرکاری دفاتر، یا عوامی مقامات۔ ان مقامات پر نماز ادا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہاں نماز پڑھنے سے کسی کے حق میں خلل نہ آئے یا قانون کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اگر ایسی زمین خاص طور پر کسی اور مقصد کے لیے مختص کی گئی ہو اور وہاں نماز پڑھنے سے نقصان ہو تو یہ مکروہ ہوگا۔

فقہ حنفی کی دلیل:

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"المراد بكره التحريم ما كان في موضع مشغول بحق غيره، أو كان فيه ضرر على المسلمين" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج 1، ص 653، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: "تحریمی کراہت وہاں ہوگی جہاں دوسرے کا حق تلف ہو یا مسلمانوں کو نقصان پہنچے"۔

خلاصہ:

۱-ارض غیر: مالک کی اجازت کے بغیر نماز مکروہ تنزیہی ہوگی لیکن ادا ہو جائے گی۔

۲-ارض مغصوبہ: غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور گناہ کے ساتھ نماز ہوگی۔

۳-حکومتی زمین: اگر عوامی یا حکومتی زمین پر نماز پڑھنے سے کسی کو نقصان نہ ہو تو جائز ہے، ورنہ مکروہ ہوگی۔

پٹرول پمپ اور ریسٹورنٹ میں نماز ادا کرنے کا حکم

سوال:(2)

پٹرول پمپ، ریسٹورنٹ جیسی جگہیں عموماً کس فرد یا ادارہ کی ملکیت ہوتی ہیں مگر چونکہ ان جگہوں سے عام لوگوں کی ضرورت وابستہ ہوتی ہے، اس لئے عام لوگوں کی آمد ورفت، لوگوں کا کچھ وقت کے لئے وہاں رکنا معمول کی بات سمجھی جاتی ہے، ایسی جگہوں پر نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی یا اس کے لئے اصل مالک سے اجازت کی ضرورت ہوگی؟

جواب:(2)

پٹرول پمپ، ریسٹورنٹ یا دیگر ایسی جگہیں جو کسی فرد یا ادارہ کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں لیکن ان سے عام لوگوں کی ضروریات وابستہ ہوتی ہیں، جیسے مسافروں کا وہاں آنا، کچھ دیر رکنا یا سہولت کے لئے استعمال کرنا، تو ان مقامات پر نماز پڑھنے کے متعلق حکم شریعت یہ ہے کہ:

اگر ان جگہوں کے مالکین نے عام لوگوں کے وہاں آنے جانے اور کچھ وقت گزارنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، تو اس عمومی اجازت کی بنیاد پر وہاں نماز پڑھنا جائز ہوگا، بشرطیکہ نماز کے لئے کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہ ہو۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ اگر ممکن ہو تو مالک سے نماز کے لئے واضح اجازت لے لی جائے تا کہ

شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے دلائل:

۱-الدرالمختار میں ہے:

"إذا لم يعلم المالک به و لم يرض فالصلاة باطلة، لأن محل الصلاة ملک الغير" (الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب شروط الصلاۃ، جلد 1، صفحہ 468، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر مالک کی اجازت معلوم نہ ہو اور اس کی رضا نہ ہوتو نماز باطل ہوگی، کیونکہ نماز کی جگہ دوسرے کی ملکیت ہے۔

۲-ردالمحتار میں علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"يجوز أداء الصلاة فی مکان جعل أصلاً للانتفاع العام، وإن لم يتحقق الإذن الخاص" (ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 602، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: ایسی جگہ پر نماز ادا کرنا جائز ہے جو عمومی فائدہ کے لئے مختص ہو، خواہ خاص اجازت نہ ہو۔

۳-البحر الرائق میں ذکر ہے:

"أما إذا کانت الأرض معدة للمرور أو الجلوس فالصلاة فيها صحيحة ما لم يمنع المالک" (البحر الرائق، جلد 1، صفحہ 174، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: جہاں زمین لوگوں کے گزرنے یا بیٹھنے کے لئے مختص ہوتو وہاں نماز

درست ہے، جب تک مالک منع نہ کرے۔

خلاصہ:

پٹرول پمپ اور ریسٹورنٹ جیسی جگہیں عمومی طور پر عوامی سہولت کے لئے مختص ہوتی ہیں، اس لئے وہاں نماز ادا کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر مالک کی طرف سے منع کیا جائے تو وہاں نماز ادا کرنا درست نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ مالک کی اجازت کی تصریح لے لی جائے تاکہ احتیاط پر عمل ہو۔

خالی پلاٹ یا مملوکہ زمین پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: (3)

لوگوں کی ملکیت جیسے خالی پلاٹ؛ کھیتی کی زمین؛ یا دکان؛ میں نماز پڑھنے کے لئے مالک کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: (3)

کسی بھی جگہ پر نماز پڑھنے کے لیے اس جگہ کے مالک کی اجازت لینا ضروری ہے، بشرطیکہ وہ جگہ کسی کی ذاتی ملکیت ہو، اور مالک نے صریحاً یا دلالۃً اجازت نہ دی ہو۔ اگر مالک کی اجازت حاصل کر لی جائے یا عرفاً یہ معلوم ہو کہ وہ اس جگہ پر نماز پڑھنے سے منع نہیں کرتا، تو نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ فقہ حنفی کی معتبر

کتابوں میں اس مسئلہ کی وضاحت موجود ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

فقہ حنفی کی تصریحات:

۱-الدرالمختار:

"لَا تَصِحُّ الصَّلَاةُ فِي مَكَانٍ مَغْصُوبٍ إِذَا كَانَ يَعْلَمُ ذَلِكَ، لِأَنَّهُ تَصَرُّفٌ فِي مِلْكِ غَيْرِهِ بِلَا إِذْنِهِ، وَذَلِكَ حَرَامٌ" (الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب شروط الصلاۃ، مطبعۃ بولاق مصر، جلد 1، صفحہ 366)

ترجمہ: "غصب کی گئی جگہ میں نماز پڑھنا درست نہیں، جب کہ نماز پڑھنے والا اس بات سے آگاہ ہو، کیونکہ یہ دوسرے کی ملکیت میں بغیر اجازت تصرف کرنا ہے، اور یہ حرام ہے"۔

۲-الہدایہ:

"وَإِذَا صَلَّى فِي أَرْضِ غَيْرِهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ لَمْ تَصِحَّ صَلَاتُهُ؛ لِأَنَّ التَّصَرُّفَ فِي مِلْكِ غَيْرِهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ لَا يَجُوزُ، فَكَذَلِكَ الصَّلَاةُ" (الہدایہ، کتاب الصلاۃ، باب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا، مطبعۃ المیمنیۃ مصر، جلد 1، صفحہ 98)

ترجمہ: "جب کسی نے دوسرے کی زمین میں بغیر اس کی اجازت کے نماز ادا کی، تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ دوسرے کی ملکیت میں بغیر اجازت تصرف جائز نہیں، اسی طرح نماز بھی جائز نہیں ہوگی"۔

۳-فتح القدیر:

"الصَّلَاةُ فِي مَكَانٍ مَغْصُوبٍ مَكْرُوهَةٌ تَحْرِيمًا، لِأَنَّهَا تَصَرُّفٌ فِي مِلْكِ غَيْرِهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ" (فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب شروط الصلاۃ، دارالفکر بیروت، جلد 1، صفحہ 241)

ترجمہ: "غصب شدہ جگہ پر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ یہ دوسرے کی ملکیت میں بغیر اجازت تصرف کرنا ہے"۔

تفصیل و تطبیق:

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں درج ذیل اصول واضح ہوتے ہیں:

ا-کسی کی ملکیت میں داخل ہونا اور نماز پڑھنا بغیر اجازت جائز نہیں، کیونکہ یہ تصرف فی ملک الغیر ہے۔

۲-اگر عرف عام میں یہ معلوم ہو کہ مالک ایسی جگہ پر نماز کی اجازت دیتا ہے، جیسے کہ کھیت یا دکان کے سامنے کا حصہ، تو نماز درست ہوگی۔

۳-مالک کی اجازت حاصل کرنا بہتر اور مستحب عمل ہے تاکہ شک وشبہ سے بچا جا سکے۔

نتیجہ:

لہٰذا، خالی پلاٹ، کھیتی کی زمین، یا دکان میں نماز پڑھنے کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے، بشرطیکہ مالک کی اجازت دلالۃً یا صراحۃً نہ ملی ہو۔

کشادہ عام راستوں پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:(4)

فقہاء نے عام طور پر راستے میں نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے، لیکن آج کل راستے عموماً چوڑے ہوتے ہیں، قومی شاہراہیں، صوبائی شاہراہیں بھی وسیع اور کشادہ ہوتی ہیں، اور سڑک کے کنارے پیدل چلنے کی جگہ بھی مختص ہوتی ہے، اس کے بعد بھی کچھ جگہیں بچی ہوتی ہیں، اس پس منظر میں فقہاء کا یہ حکم باقی رہے گا یا وہ حکم چھوٹے اور تنگ راستوں کے لئے مختص مانا جائے گا جہاں نماز کی وجہ سے چلنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے؟

جواب:(4)

شریعت اسلامی نے نماز کو ایک عظیم عبادت قرار دیا ہے اور اس کی ادائیگی میں ہر ممکن سہولت پیدا کی ہے۔ فقہاء نے راستے میں نماز پڑھنے کو عمومی طور پر مکروہ قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ راستے کے عام حقوق کی پامالی، لوگوں کے لیے تکلیف، اور خشوع وخضوع میں کمی قرار دی گئی ہے۔

فقہاء کی تصریحات:

فقہ حنفی کی کتب میں اس مسئلے پر وضاحت موجود ہے:

۱-الدرالمختار میں ہے:

"ویکره أن یصلی فی الطریق، لأن فیه ضررًا بالعابرین، ولأن الطریق معدة لسلوک الناس" (الدرالمختار مع ردالمحتار، جلد1، صفحہ617، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ:"راستے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ اس میں گزرنے والوں کے لیے تکلیف ہے اور راستہ لوگوں کے چلنے کے لیے بنایا گیا ہے"۔

۲-البحرالرائق میں ذکر ہے:

"الصلاة فی الطریق مکروهة إذا ضاق الطریق ولم یجدوا سبیلًا للسیر" (البحرالرائق، جلد1، صفحہ368، مطبع دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ:"راستے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جب راستہ تنگ ہو اور لوگوں کے گزرنے کا راستہ نہ ملے"۔

۳-فتح القدیر میں یہ صراحت ہے:

"أما إذا کان الطریق واسعًا بحیث لا یتضرر العابرون، فلا کراهة حینئذ" (فتح القدیر، جلد1، صفحہ226، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ:"اگر راستہ اتنا کشادہ ہو کہ گزرنے والے لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو تو اس وقت مکروہ نہیں ہوگا"۔

موجودہ دور کے حالات:

آج کل کے کشادہ راستے، قومی شاہراہیں، اور پیدل چلنے کے لیے مختص

جگہیں فقہاء کے ان اصولوں سے خارج ہیں جہاں راستے کی تنگی یا لوگوں کی تکلیف کی وجہ سے نماز مکروہ قرار دی گئی ہے۔

لہٰذا:

۱-اگر راستہ کشادہ ہو اور نماز پڑھنے سے چلنے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو تو راستے میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا۔

۲-تاہم، اگر نماز پڑھنے سے ٹریفک یا پیدل چلنے والوں کو کوئی رکاوٹ پیش آئے، تو یہ عمل مکروہ ہوگا۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کی روشنی میں آج کے کشادہ راستوں پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ اس سے لوگوں کے لیے کسی قسم کی زحمت یا رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ بھی بہتر ہے کہ نماز کسی ایسی جگہ ادا کی جائے جہاں خشوع وخضوع متاثر نہ ہو اور عام لوگوں کے حقوق محفوظ رہیں۔

ریلوے اسٹیشن اور ایئرپورٹ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:(5)

ریلوے اسٹیشن، ایرپورٹ اور حکومت کی ملکیت والے دیگر مقامات پر نماز

پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:(5)

ریلوے اسٹیشن، ایر پورٹ اور دیگر سرکاری یا عوامی جگہوں پر نماز پڑھنے کا حکم فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل اصولوں اور شرائط کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

نماز کی اہمیت اور عمومی حکم:

اسلام میں نماز فرض عبادت ہے اور اسے کسی بھی حالت میں ترک نہیں کیا جاسکتا، چاہے حالات کتنے ہی مشکل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا" (النساء:103)

ترجمہ: "بے شک نماز مومنوں پر وقت مقررہ میں فرض ہے"۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جعلت لی الأرض مسجداً و طهوراً" (صحیح بخاری، حدیث:335)

ترجمہ: "میرے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنایا گیا ہے"۔

ریلوے اسٹیشن اور ایئرپورٹ پر نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت:

فقہ حنفی میں یہ اصول موجود ہے کہ نماز ایسی جگہ پر ادا کی جاسکتی ہے جو پاک ہو اور وہاں نماز کی شرائط و آداب کی رعایت ممکن ہو، بشرطیکہ اس جگہ کا استعمال شریعت کے خلاف نہ ہو۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالے:

۱-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"لا تجوز الصلاة على الأرض المغصوبة، لأنها معصية، والصلاة عبادة، فلا تجتمعان" (الفتاویٰ الہندیۃ، جلد 1، صفحہ 56، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: "غصب شدہ زمین پر نماز جائز نہیں کیونکہ یہ گناہ ہے، اور نماز عبادت ہے، گناہ اور عبادت یکجا نہیں ہو سکتے"۔

۲-درمختار میں لکھا ہے:

"والأماكن المعدة للنفع العام تجوز الصلاة فيها إذا تحققت الطهارة" (درمختار، جلد 1، صفحہ 359، مطبع دار المعرفۃ بیروت)

ترجمہ: "عوامی فائدے کے لیے بنائی گئی جگہوں پر نماز جائز ہے، اگر پاکیزگی ثابت ہو"۔

۳-بدائع الصنائع میں ہے:

"إذا لم تكن الأرض مملوكة لأحد، وكانت مأذونة للانتفاع بها، فالصلاة فيها جائزة" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 129، مطبع دار الکتب العربیۃ)

ترجمہ: "اگر زمین کسی کی ملکیت نہ ہو اور اس کے استعمال کی اجازت ہو تو وہاں نماز جائز ہے"۔

مسئلے کا خلاصہ:

ریلوے اسٹیشن، ایئر پورٹ، یا حکومت کی دیگر جگہوں پر نماز پڑھنا درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

۱-جگہ پاک ہواور نجاست سے خالی ہو۔

۲-وہاں نماز کی شرائط (قبلہ رخ ہونا، خشوع وخضوع) کی رعایت ممکن ہو۔

۳-یہ جگہ عوامی استعمال کے لیے ہواور اس میں نماز پڑھنے سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

اگران شرائط پر عمل کیا جائے توان جگہوں پر نماز جائز اور درست ہوگی۔

موجودہ صورت حال میں ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن پر نماز کا حکم

سوال:(6)

ہندوستان کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ایئرپورٹ یاریلوے اسٹیشن یا کسی عوامی یا سرکاری جگہ پر کوئی مسلمان اگرنماز پڑھتا ہےتو اس کو ہندوغیرمسلم پکڑ کر مارنا پیٹنا شروع کردیتے ہیں؛ بہت سی جگہوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ پولیس نے ان پر کیس اور مقدمہ دائر کردیا ہے؛ اس صورتحال میں سوال یہ ہے کہ ان جگہوں پر جہاں پانچ سال پہلے بلاخوف وخطر لوگ نماز ادا کرتے تھےلیکن آج نماز ادا کرنا مشکل ہے؛اس

صورتحال میں نماز کا وقت آ جائے تو نمازی کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب:(6)

مذکورہ صورتحال میں مسلمان کو نماز جیسے اہم فرض کی ادائیگی میں کسی طرح کی سستی یا کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ نماز دین کا ستون اور اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔تاہم، شریعت نے نماز کے اوقات اور ادائیگی کے مقامات میں سہولت اور حکمت کو بھی مدنظر رکھا ہے۔اگر کسی جگہ پر نماز پڑھنے کی وجہ سے جان یا عزت کو خطرہ لاحق ہو تو ایسی حالت میں شریعت کے احکام درج ذیل ہیں:

نماز کے اہم اصول اور رہنمائی:

۱-نماز کا قضا نہ ہونا: نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا فرض ہے،لیکن اگر کھلے عام نماز پڑھنے سے جانی یا مالی نقصان کا اندیشہ ہو تو مناسب جگہ تلاش کر کے نماز ادا کریں۔اگر ایسا ممکن نہ ہو تو نماز کو قضا کرنے کے بجائے کسی محفوظ جگہ پر اشارے سے یا بیٹھ کر پڑھ لیں۔

۲-نماز کو مؤخر کرنا: اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نماز وقت پر کھڑے ہو کر پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس وقت کو اتنا مؤخر کیا جا سکتا ہے جب تک جان اور عزت کا خطرہ ٹل نہ جائے،لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نماز قضا نہ ہو۔

۳-نماز کی حفاظت: فقہاء نے ان حالات میں جہاں نماز پڑھنے کی صورت میں فتنہ یا نقصان ہو، ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کی اجازت دی ہے جو

شریعت کے دائرے میں ہو اور انسان کی سلامتی بھی محفوظ رہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَإِنْ خَافَ عَلَى نَفْسِهِ أَوْ مَالِهِ يُصَلِّي قَاعِدًا أَوْ بِالْإِيمَاءِ وَيُؤَخِّرُ إِنْ أَمْكَنَ إِلَى زَوَالِ الْعُذْرِ" (ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 419، دارالفکر بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کو اپنی جان یا مال کا خوف ہو تو وہ بیٹھ کر یا اشارے سے نماز ادا کرے، اور اگر ممکن ہو تو عذر کے ختم ہونے تک نماز کو مؤخر کرے۔

۲-فتح القدیر

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَلَوْ كَانَ فِي مَوْضِعٍ لَا يُؤْمَنُ عَلَى نَفْسِهِ أَوْ مَالِهِ فَصَلَّى بِالْإِيمَاءِ فَلَهُ ذَلِكَ" (فتح القدیر، جلد 1، صفحہ 360، داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ: اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں اپنی جان یا مال پر خطرہ ہو تو اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہے۔

۳-البحر الرائق

فقہاء نے لکھا ہے:

"إِذَا خِيفَ عَلَى النَّفْسِ أَوْ الْمَالِ تُؤَخَّرُ الصَّلَاةُ إِلَى أَنْ يَأْمَنَ

الْمُصَلِّی" (البحر الرائق، جلد 2، صفحہ 82، مطبع رشیدیہ)

ترجمہ: اگر جان یا مال پر خطرہ ہوتو نماز کو اس وقت تک مؤخر کیا جا سکتا ہے جب تک نمازی کو امن نہ حاصل ہو۔

حکم:

موجودہ حالات میں مسلمان کو نماز کے وقت ایسے مقام کا انتخاب کرنا چاہیے جو محفوظ ہو، جیسے مسجد، گھر، یا کوئی ایسی جگہ جہاں کسی کا خطرہ نہ ہو۔ اگر محفوظ جگہ نہ ملے اور وقت قضا ہونے کا اندیشہ ہوتو اشارے سے یا بیٹھ کر نماز پڑھ لی جائے۔ یہ نماز بالکل درست ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ یہ مجبوری کے تحت نماز کو قبول فرمائے گا۔

ٹرین اور جہاز میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: (7)

ٹرین، جہاز جیسی بڑی سواری گاڑیاں جو حکومت کی ملکیت ہوتی ہیں، ان میں خالی جگہ بھی ہوتی ہیں، جہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے، ایسی جگہوں پر نماز ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(7)

ٹرین، جہاز، یا دیگر بڑی سواریوں میں نماز ادا کرنے کے مسئلے کو اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے۔

نماز کا حکم سواری میں:

سواری میں نماز ادا کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ نماز کے دوران رخ قبلہ کی طرف ہو اور مکمل قیام، رکوع اور سجدہ ادا کیا جائے۔ اگر قیام اور رکوع وسجدہ کے لیے جگہ موجود ہو اور رخ قبلہ کی طرف ممکن ہو، تو ایسی جگہ پر نماز درست ہے، چاہے وہ جگہ حکومت کی ملکیت ہو۔

فقہ حنفی کے مستند حوالہ جات:

۱- درمختار:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''درمختار'' میں بیان کیا گیا ہے:

"وإذا أمكنه أداء الفريضة مستقبل القبلة قائماً راكعاً ساجداً وجب وإلا صلى حسب حاله، ويعيدها على الصحيح" (درمختار مع ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 595، دارالفکر بیروت)

ترجمہ: اگر مسافر کے لیے ممکن ہو کہ فرض نماز قبلہ رخ قیام، رکوع اور سجدہ کے ساتھ ادا کرے، تو یہ واجب ہے۔ اور اگر ممکن نہ ہو تو حالت کے مطابق نماز ادا

کرے، مگر (حالت سفر میں) اس نماز کو بعد میں دہرانا ضروری ہوگا۔

۲-ہدایہ:

کتاب ''ہدایہ'' میں ذکر ہے:

''ومنها الاستقبال فی الصلاة فرضاً کان أو نفلاً إلا فی السفینة إذا کان علی الأرض عندنا'' (ہدایہ، جلد 1، صفحہ 90، مطبعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

ترجمہ: نماز میں قبلہ رخ ہونا فرض ہے، خواہ وہ فرض نماز ہو یا نفل، سوائے اس کے کہ نماز کشتی یا سواری میں ہو اور زمین پر اترنے کا موقع نہ ملے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری:

فتاویٰ عالمگیری میں ذکر ہے:

''وإذا کان فی السفینة أو العجلة ووجد مکانا علی الأرض یصلی فیه قائماً ویرکع ویسجد وجب علیه ذلک'' (الفتاویٰ الہندیہ، جلد 1، صفحہ 54، دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر مسافر کشتی یا گاڑی میں ہو اور زمین پر ایسی جگہ مل جائے جہاں قیام، رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز ادا کی جاسکے، تو یہ واجب ہوگا۔

حاصل مسئلہ:

ٹرین یا جہاز میں اگر ایسی جگہ موجود ہو جہاں نماز کے ارکان (قیام، رکوع، سجدہ) مکمل ادا کیے جاسکیں اور رخ قبلہ کی طرف ہو، تو وہاں نماز ادا کرنا جائز اور درست ہے۔ ایسی جگہیں عام طور پر استعمال کے لیے حکومت کی طرف سے مہیا کی

جاتی ہیں، لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں۔ تاہم، اگر ایسا ممکن نہ ہو اور نماز قضا ہونے کا اندیشہ ہو، تو حالت کے مطابق نماز ادا کی جائے، اور بعد میں اس نماز کو دہرانا ضروری ہوگا۔

جہاز کے سفر میں وضو کے لئے نہ پانی ہو نہ مٹی تو وضو کا کیا حکم ہے؟

سوال:(8)

جہاز میں اتنا پانی نہیں ہوتا کہ اس سے وضو کیا جاسکے ایسی صورت میں جب کہ سفر لمبا ہو اور کئی نمازیں جہاز میں ادا کرنی پڑے اور وضو کا انتظام نہ ہو اور نہ ہی تیمم کے لیے مٹی ہو تو اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب:(8)

اگر کسی مسافر کو ہوائی جہاز میں وضو یا تیمم کے لیے پانی یا مٹی میسر نہ ہو اور نماز قضا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں نماز کی قضا جائز نہیں ہے۔ فقہ حنفی میں اس بات کی تصریح ہے کہ اگر طہارت کے لیے کوئی چیز میسر نہ ہو تو نماز بلا طہارت ادا کی جائے گی، البتہ بعد میں طہارت کے ساتھ دوبارہ نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔ یہ حکم اس قاعدہ شرعیہ پر مبنی ہے کہ **"ما لا یدرک کله لا یترک کله"** یعنی جب پوری شرط پوری نہ ہو سکے تو جتنا ممکن ہو، اتنا عمل کیا جائے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے:

١-الدرالمختار مع ردالمحتار:

"ولو عدم الماء والتراب صلى بغير طهارة وعليه الإعادة" (جلد 1، صفحہ 255، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر پانی اور مٹی دونوں نہ ہوں تو بے طہارت نماز پڑھے اور بعد میں اعادہ واجب ہوگا۔

٢-فتاوی عالمگیری:

"إن لم يجد ماء ولا ترابا يصلي بغير طهارة ثم يعيد" (جلد 1، صفحہ 38، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر پانی اور مٹی نہ ملے تو بغیر طہارت کے نماز پڑھے اور بعد میں اعادہ کرے۔

٣-البحرالرائق:

"فلو عدم الطهورين صلى بلا طهارة وعليه الإعادة" (جلد 1، صفحہ 220، مطبع دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اگر پانی اور مٹی دونوں نہ ہوں تو بے طہارت نماز ادا کرے اور اس پر اعادہ واجب ہوگا۔

شرعی حکم:

ایسی صورت میں مسافر بلا وضو نماز ادا کرے گا، کیونکہ نماز کو کسی بھی صورت میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم جب وضو یا تیمم کا انتظام ہو جائے تو اس وقت وہ نماز دوبارہ ادا کرنا ضروری ہوگا۔

ٹرین کے سفر میں ٹرین کا پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے وضو کی ہمت نہیں تو کیا کرے؟

سوال:(9)

ایک آدمی دسمبر جنوری کے مہینے میں جب کہ سخت سردی ہوتی ہے ٹرین کا سفر کر رہا ہے ٹرین میں پانی ہے لیکن وہ اتنا ٹھنڈا ہے کہ اس سے وضو کرنے کی اس کو ہمت نہیں ہو رہی ہے کیونکہ وہ شوگر اور دوسرے امراض میں مبتلا ہے اور گرم پانی میسر نہیں ہے ایسی صورت میں اس کے لیے کیا حکم ہے یہ نماز کیسے ادا کرے؟

جواب:(9)

ایسی صورت میں جب شدید سردی ہو، گرم پانی میسر نہ ہو، اور سرد پانی کے استعمال سے مرض بڑھنے یا بیماری کے لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، تو اسلامی شریعت نے تیمم کی اجازت دی ہے۔ تیمم ایک شرعی رخصت ہے، جو ان حالات میں وضو یا غسل

کے بدل کے طور پر کی جاتی ہے۔

حکم کی تفصیل:

فقہ حنفی کے مطابق، اگر کوئی شخص پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو یا اس کے استعمال سے بیماری میں اضافہ یا ہلاکت کا اندیشہ ہو تو تیمم جائز ہے۔

مستند کتب کی عبارات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

"وإن خاف استعماله لمرض يفضي إلى الهلاك أو زيادة مرض أو بطوء برء تيمم" (جلد 1، صفحہ 262، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ پانی کے استعمال سے مرض ہلاکت تک پہنچ جائے گا یا بیماری بڑھ جائے گی یا شفایابی میں تاخیر ہوگی تو وہ تیمم کر لے۔

۲-بدائع الصنائع:

"وأما إذا كان يخاف التلف أو ذهاب منفعة عضو أو حدوث مرض يخاف منه التلف أو فوات منفعة عضو فإنه يجوز له التيمم" (جلد 1، صفحہ 100، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کو ہلاکت، کسی عضو کے فائدے کے ختم ہونے، یا ایسے مرض کے لاحق ہونے کا ڈر ہو جو ہلاکت تک پہنچا سکتا ہو یا کسی عضو کے فائدے کو ختم کر سکتا ہو، تو تیمم جائز ہے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری:

"إذا كان يجد الماء إلا أنه يخاف برداً شديداً, وخاف على نفسه الهلاك أو مرضاً شديداً فإنه يتيمم" (جلد 1، صفحہ 25، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگرکسی کو پانی تو میسر ہو لیکن سخت سردی کا خوف ہو اور اپنی جان یا کسی شدید بیماری کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کرے۔

عملی طریقہ:

۱-تیمم کرنے کے لیے پاک مٹی یا گردآلود کسی پاک چیز پر ہاتھ ماریں۔

۲-دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لیں۔

۳-دوبارہ ہاتھ مار کر کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر پھیر لیں۔

خلاصہ:

مذکورہ حالت میں، جب سرد پانی کے استعمال سے بیماری کے بڑھنے کا اندیشہ ہو، تو وہ شخص وضو کے بجائے تیمم کر کے نماز ادا کرے۔ یہ اسلامی شریعت کی رخصت ہے اور اللہ تعالیٰ نے دین میں آسانی پیدا کی ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (سورۃ التغابن:16)

ترجمہ: پس اللہ سے ڈرو جہاں تک تمہارے لیے ممکن ہو۔

حکومت کی مملوکہ جگہوں پر نماز کی اجازت کی علامت کیا ہوگی؟

سوال:(10)

ارضِ غیر اور حکومت کے زیر ملکیت مقامات میں نماز پڑھنے کے لئے اجازت کی کیا علامت ہوگی؟ کیا نماز کی ممانعت نہ ہونا اجازت کے لئے کافی سمجھا جائے گا؟

جواب:(10)

ارضِ غیر (دوسرے کی زمین) یا حکومت کے زیرِ ملکیت مقامات میں نماز پڑھنے کے لئے اجازت کی علامت اور ممانعت نہ ہونے کو اجازت کی دلیل کے طور پر سمجھنے کے مسئلے کو شریعت اور فقہ حنفی کی روشنی میں جانچنا ضروری ہے۔

شرعی اصول:

اسلامی شریعت میں کسی کی ملکیت میں داخل ہونے یا اس کا استعمال کرنے کے لئے مالک کی اجازت ضروری ہوتی ہے، خواہ وہ زمین کسی فرد کی ہو یا حکومت کی۔ اس بارے میں فقہ حنفی میں متعدد اصول موجود ہیں:

۱- عدمِ ممانعت کا اصول:

اگر کوئی جگہ عام لوگوں کے استعمال میں ہو اور وہاں نماز کے لئے کوئی

ممانعت نہ ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ مالک یا حکومت نے اس مقام کو عوامی استعمال کے لئے کھلا رکھا ہے۔ ایسی صورت میں نماز پڑھنا جائز ہوگا، بشرطیکہ نماز کی دیگر شرائط پوری ہوں اور کوئی مفسدہ نہ ہو۔

۲-اجازت کی صراحت:

فقہاء نے وضاحت کی ہے کہ اگر کسی جگہ کو عوامی یا عمومی استعمال کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ جگہ شرعی اعتبار سے قابلِ استعمال ہوگی۔ مثلاً بازار، پارک، یا سرکاری دفاتر کے میدان، بشرطیکہ وہاں نماز پڑھنے پر کوئی پابندی عائد نہ ہو۔

فقہی عبارات:

۱-ہدایہ میں ہے:

"وَإِذَا وَقَعَ السُّجودُ عَلَى مِلْكِ الْغَيْرِ لَا يَجُوزُ إِلَّا بِإِذْنِهِ صَرَاحَةً أَوْ دِلَالَةً" (ہدایہ، جلد 1، صفحہ 146، مطبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: "اگر سجدہ کسی اور کی ملکیت میں ہو تو یہ جائز نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ اس کی اجازت صراحتاً یا دلالتاً موجود ہو"۔

۲-درمختار میں ہے:

"الْإِذْنُ يَكُونُ بِالتَّصْرِيحِ أَوْ بِتَرْكِ الْمَنْعِ" (درمختار مع ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 521، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: ''اجازت صریح الفاظ کے ذریعے بھی ہوسکتی ہے اور ممانعت کے نہ ہونے کے ذریعے بھی''۔

۳-فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے:

''إِذَا كَانَتِ الْأَرْضُ مِمَّا يَتَعَاطَاهَا النَّاسُ بِإِذْنِ الْمَالِكِ عَادَةً، يَكُونُ ذَٰلِكَ إِذْنًا'' (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، صفحہ 57، مطبع حیدرآباد)

ترجمہ: ''اگر زمین ایسی ہو جسے لوگ عام طور پر مالک کی اجازت سے استعمال کرتے ہوں، تو یہ اجازت شمار ہوگی''۔

خلاصہ:

اگر حکومت یا مالک کی طرف سے جگہ عام لوگوں کے لئے کھلی ہو اور وہاں نماز کی ممانعت نہ کی گئی ہو، تو یہ اجازت کے قائم مقام ہوگی۔

لیکن اگر واضح ممانعت موجود ہو، تو وہاں نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ حقوق العباد کی خلاف ورزی ہوگی۔

البتہ بہتر یہ ہے کہ ممکن ہو تو نماز کے لئے مخصوص یا نجی جگہ کا انتخاب کیا جائے۔

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

آباءواجداد کی کمائی حرام تھی اب اولاد کیا کرے؟

سوال:(1)

ایک آدمی فی الحال حلال کاروبار کررہا ہے لیکن اس کے آباءواجداداس حرام کاروبار میں ملوث تھے اس کومعلوم ہے کہ اس حرام کاروبار کا مال اس کووراثت میں ملا ہے مگر وہ اسی سے اب حلال کاروبار کررہا ہے اور گھر جائیداد بھی اسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد تو اس کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ چونکہ آزادی سے پہلے دارالحرب ہونے کی وجہ سے سودی کاروبار ھورتھا آزادی کے بعد بند ہوگیا۔

جواب:(1)

آپ کے سوال کا جواب درج ذیل تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

قرآن وحدیث کی روشنی میں اصولی وضاحت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سود کو سختی کے ساتھ حرام قرار دیا ہے:

"الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِى يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ" (سورۃ البقرۃ:275)

یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے کسی کو شیطان نے مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔

اسی طرح حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الرِّبَا سَبْعُونَ حُوبًا أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ" (ابن ماجہ، حدیث:2274)

یعنی سود کے گناہوں کی ستر اقسام ہیں، ان میں سب سے ہلکی یہ ہے کہ انسان اپنی ماں سے نکاح کرے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہاء نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ اس کے مال میں حرام شامل ہے اور وہ مقدار معلوم ہو تو اسے واجب ہے کہ اتنی رقم کو حلال طریقے سے خرچ کرے، مثلاً فقراء کو صدقہ دے یا جائز ضرورت پر خرچ کرے، بغیر نیتِ ثواب کے۔

اگر حرام مال کی مقدار معلوم نہ ہو لیکن غالب گمان ہو کہ اس میں حرام کا حصہ زیادہ ہے، تو اس کا تصفیہ کرنا واجب ہے۔

دار الحرب اور دار الاسلام کا مسئلہ:

فقہ حنفی میں دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینے کی اجازت دی گئی ہے،

جیسا کہ ''ہدایہ'' میں ذکر ہے:

''فَإِنْ كَانَ فِي دَارِ الْحَرْبِ وَقَامَ مَالُهُ عَلَى الرِّبَا فَإِنَّهُ حَلَالٌ، إِذَا كَانَ قَائِمًا عَلَى غَيْرِ مَا يَحْرُمُ عَلَيْهِمْ'' (الہدایہ، کتاب الکسب)

تاہم آزادی کے بعد ہندوستان دارالاسلام کے حکم میں ہے، اس لیے اب سود لینا حرام ہے، چاہے وہ کسی سے بھی لیا جائے۔

آپ کے مسئلے کی تفصیل:

۱- اگر آپ کے آباواجداد نے آزادی سے پہلے دارالحرب کے زمانے میں سودی کاروبار کیا اور مال جمع کیا ہو، تو یہ مال اصولی طور پر حلال ہوگا، کیونکہ اس وقت کے حالات میں یہ جائز سمجھا جاتا تھا۔

۲- اگر وہ مال آزادی کے بعد سودی کاروبار سے جمع ہوا ہو تو یہ مال ناجائز ہوگا۔

۳- موجودہ صورت میں، اگر آپ کو یہ یقین نہیں کہ مال کس دور کا ہے، تو حلال اور حرام میں شک کی بنیاد پر احتیاط لازم ہے۔

۴- بہتر یہ ہے کہ آپ اس مال کا کچھ حصہ صدقہ کریں، تاکہ آپ کا ضمیر مطمئن ہو اور آپ کے کاروبار میں برکت ہو۔

نتیجہ:

آپ کے موجودہ حلال کاروبار سے کمائی ہوئی آمدنی کو شرعی طور پر حلال سمجھا جائے گا، بشرطیکہ آپ کا کاروبار مکمل طور پر حلال ذرائع پر مبنی ہو۔

البتہ، اگر یقین ہو کہ جائیداد میں حرام مال شامل ہے، تو اسے پاک کرنے کے لیے مناسب مقدار صدقہ کرنا بہتر ہے، جیسا کہ فقہاء نے بیان کیا ہے۔

حرام مال کی آمدنی کا حکم

سوال:(2)

ایک غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائیداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل کیا ہوا ہے اسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے اب جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:(2)

ایسے شخص کے بارے میں فقہِ حنفی کے اصول کی روشنی میں حکم یہ ہے کہ جو مال یا جائیداد حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، اس کی ملکیت شرعاً درست نہیں ہوتی۔ اس لیے اس مال کو صدقہ کرنا ضروری ہے، تا کہ وہ مال پاک ہو جائے۔ تاہم، اس میں کچھ تفصیل ہے:

۱-حرام مال کی توبہ اور اس کا حکم:

فقہ حنفی کے مطابق، اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ اس کا مال حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہے، تو اس پر واجب ہے کہ وہ فوراً توبہ کرے اور اس مال کو اصل مالک یا

وارثین کو واپس کرے، اگر ان کا پتہ ہو۔ اگر مالک کا پتہ نہ ہو، تو اسے بلا نیتِ ثواب صدقہ کر دینا واجب ہے۔

۲-حرام مال سے حاصل شدہ آمدنی کا حکم:

اگر وہ جائیداد یا مال حرام ذرائع سے خریدا گیا تھا اور اب اس سے کرایہ وغیرہ کی شکل میں آمدنی حاصل ہو رہی ہے، تو اس آمدنی کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ حلال نہیں ہے۔ اسے بھی اصل مالک کو لوٹانا یا صدقہ کرنا ضروری ہے۔

۳-فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے حوالے:

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"وَإِنْ كَانَ مَالُهُ كُلُّهُ حَرَامًا فَيَجِبُ عَلَيْهِ التَّخَلُّصُ مِنْهُ بِإِعَادَتِهِ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَصْحَابَهُ يَصْرِفُهُ إِلَى الْفُقَرَاءِ وَالْمَصَالِحِ الْعَامَّةِ"

(ردالمختار، کتاب البیوع، فصل فی البیع الفاسد)

نیز امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"الْحَرَامُ لَا يَصِيرُ حَلَالًا بِالتَّصَرُّفِ، وَإِنَّمَا يَجِبُ الرَّدُّ إِلَى مَنْ يَسْتَحِقُّهُ، وَإِنْ لَمْ يُعْلَمْ صَاحِبُهُ يُتَصَدَّقُ بِهِ فِي وُجُوهِ الْخَيْرِ" (احیاء علوم الدین، کتاب الحلال والحرام)

خلاصہ:

ایسے شخص پر ضروری ہے کہ وہ:

۱-فوراً سچے دل سے توبہ کرے۔

۲-اپنی جائیداد اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کو اصل مالک کو لوٹانے کی کوشش کرے۔

۳-اگر اصل مالک کا پتہ نہ ہو، تو اس مال کو بلا نیتِ ثواب صدقہ کر دے۔

شوہر کی مکمل کمائی حرام ہو تو بیوی کیا کرے؟

سوال:(3)

شوہر یا بیٹا حرام طریقے پر کمائی کر رہا ہے ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے اور اس کاروبار سے باز نہیں آ رہا ہے اور اس غریب خاتون کے لیے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس عورت کو کیا کرنا چاہیے؟ یا حرام کمائی سے اپنے بچے کو پڑھایا لکھایا اعلیٰ تعلیم بھی دی اب پڑھنے کے بعد بچہ کمائی کر رہا ہے اس کمائی کا کیا حکم ہے؟

جواب:(3)

اگر شوہر یا بیٹا حرام طریقے سے کمائی کر رہے ہوں اور ماں یا بیوی کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود وہ اس برے عمل سے باز نہ آئیں تو اس صورت میں عورت کو درج ذیل امور پر عمل کرنا چاہیے:

پہلی صورت: شوہر کی حرام کمائی کے ساتھ زندگی گزارنا۔

۱- اگر شوہر حرام کمائی پر اصرار کرے اور بیوی کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ ہو، تو بیوی اس مال کو استعمال کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ بنیادی ضروریات (روٹی، کپڑا، مکان) کا انتظام کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ تاہم، بیوی کے دل میں کراہت اور اللہ سے استغفار کا ہونا ضروری ہے۔

۲- بیوی کو چاہیے کہ وہ ہر ممکن حد تک شوہر کو سمجھائے اور دعا کرے کہ اللہ اس کو حلال روزگار پر لے آئے۔

دوسری صورت: حرام کمائی سے تعلیم دینا۔

اگر ماں یا بیوی نے مجبوراً حرام مال سے اپنے بچے کو تعلیم دلائی ہے اور اب بچہ حلال ذریعہ سے کمائی کرر ہا ہے، تو اس بچے کی کمائی حلال ہوگی بشرطیکہ وہ خود حلال روزگار اختیار کرے۔ حرام مال سے دی گئی تعلیم کا اثر کمائی پر نہیں پڑے گا۔

قرآن وحدیث کے حوالے:

۱-حرمتِ مالِ حرام:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"**وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ**" (البقرۃ:188)

ترجمہ: اور تم اپنے مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ۔

۲-رزقِ حلال کی اہمیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ" (شعب الایمان للبیہقی، حدیث: 5313)

ترجمہ: ہر مسلمان پر حلال رزق کا طلب کرنا فرض ہے۔

فقہ حنفی کے مطابق:

فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ حرام مال اگر مجبوراً استعمال کیا جائے، تو گناہ اس شخص پر ہوگا جو حرام کمائی کرتا ہے، بشرطیکہ دوسرا شخص اس میں کراہت کے ساتھ شامل ہو۔ (ردالمحتار، جلد 5، ص 259)

نصیحت:

۱-شوہر یا بیٹے کو بار بار نصیحت کی جائے کہ حرام کمائی چھوڑ دیں، کیونکہ حرام کمائی سے عبادات اور دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

۲-اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ وہ انہیں ہدایت دے اور رزق حلال عطا کرے۔

مشکوک کمائی کی دعوت کا حکم

سوال: (4)

اکثر بستی والے شادی بیاہ اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں اور زیادہ تر حرام

کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جب دعوت دیتے ہیں تو ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھی حرام ہے اور آدھی حلال ہے تو اس وقت اس کی دعوت میں کھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(4)

آپ کے سوال کا جواب قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل ہے:

قرآن مجید کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا"۔

ترجمہ: اور اس میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں حلال اور پاکیزہ عطا فرمایا ہے۔ (سورۃ النحل:114)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مسلمان کو صرف حلال اور پاکیزہ رزق ہی استعمال کرنا چاہیے۔

حدیث مبارکہ کی روشنی میں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا"۔

ترجمہ: بے شک اللہ پاک ہے اور پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث: 1015)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ، النَّارُ أَوْلَى بِه"۔

ترجمہ: وہ گوشت جنت میں داخل نہیں ہوگا جو حرام سے پلا بڑھا ہو، آگ اس کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ (مسند احمد، حدیث: 13974)

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی کے مطابق، اگر کسی شخص کی آمدنی مکمل طور پر حرام ہو تو اس کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔ لیکن اگر اس کی آمدنی مشکوک ہو یا اس میں حلال و حرام دونوں شامل ہوں تو اس صورت میں غالب حصہ کو مدنظر رکھا جائے گا۔ اگر غالب آمدنی حرام ہو تو کھانے سے اجتناب بہتر ہے، لیکن اگر غالب آمدنی حلال ہو تو دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"وَإِذَا كَانَ أَكْثَرُ مَالِهِ مِنَ الْحَرَامِ يَحْرُمُ تَنَاوُلُ طَعَامِهِ عَلَى رَأْيٍ لَكِنْ عَلَى الظَّاهِرِ لَا يَحْرُمُ مَعَ الْكَرَاهَةِ"۔

ترجمہ: اگر کسی کی زیادہ تر آمدنی حرام ہو تو اس کا کھانا کھانا ناجائز ہے، لیکن ظاہر میں کراہت کے ساتھ جائز مانا جاتا ہے۔ (ردالمحتار، جلد 9، صفحہ 632)

خلاصہ وحکم:

اگر آپ کو یقین ہو کہ کسی شخص کی مکمل آمدنی حرام ہے تو اس کی دعوت میں کھانے سے اجتناب کریں۔ لیکن اگر اس کی آمدنی میں حلال وحرام دونوں شامل ہوں اور غالب آمدنی حلال ہو تو دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہے۔ تاہم، بہتر یہی ہے کہ ایسی دعوتوں سے بچا جائے جہاں حرام کا شبہ ہو تاکہ تقویٰ کا پہلو محفوظ رہے۔

دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ دعوت حرام کمائی سے کی گئی تھی تو اب کیا حکم ہے؟

سوال:(5)

کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو وہ کس طرح اس کی تلافی کرے؟

جواب:(5)

اگر کسی شخص نے کسی کی دعوت کھائی اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس شخص کا تمام مال حرام ذرائع سے حاصل ہوا ہے، تو شریعت کی رو سے اس کی دعوت کھانا ناجائز تھا۔ ایسے معاملے میں تلافی کے لئے درج ذیل احکام فقہ حنفی کی روشنی میں ملتے ہیں:

۱- دعوت کھانے کے بعد توبہ واستغفار کرنا:

اگر لاعلمی کی وجہ سے دعوت کھائی گئی تو شریعت میں ایسے شخص پر گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن جب معلوم ہو جائے کہ وہ مال حرام ذرائع سے ہے، تو اللہ تعالی سے سچی توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے۔

۲- مال کی واپسی یا تلافی کا حکم:

اگر کھانے کی قیمت کی مقدار معلوم ہو تو فقہ حنفی کے اصول کے مطابق یہ مال صدقہ کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ حرام مال سے جو فائدہ اٹھایا گیا ہے، اس کی تلافی ضروری ہے۔

۳- فقہ حنفی کی مستند عبارت:

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"من أكل طعاما حراما بجهالة ثم علم به، وجب عليه التصدق بمقدار ما أكل إن كان يعلم قدره، فإن لم يعلم فيتحرى ويعمل بغالب ظنه"

(ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الکسب، 9/520)

۴- حرام مال سے اجتناب کی تاکید:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"كل لحم نبت من سحت فالنار أولى به" (سنن الترمذی، حدیث نمبر: 614)

ترجمہ: ہر وہ گوشت جو حرام سے پروان چڑھے، اس کے لیے جہنم زیادہ موزوں ہے"۔

خلاصہ:

لہٰذا دعوت کھانے کے بعد، اگر معلوم ہو جائے کہ وہ حرام ذرائع سے تھا، تو کھانے کی قیمت کے برابر مال صدقہ کر دینا چاہیے اور اللہ سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ آئندہ ایسی دعوت قبول کرنے میں احتیاط کرنا لازم ہے۔

حرام مال کو حلال بنانے کا کوئی طریقہ ہے؟

سوال:(6)

کیا پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ ہے؟

جواب:(6)

حرام مال کو حلال بنانے کی کوئی ایسی تدبیر یا حیلہ نہیں ہے جس سے وہ شریعت کی نظر میں جائز ہو جائے۔ حرام مال کی کمائی اگر کسی ناجائز طریقے (جیسے چوری، دھوکہ، سود، رشوت یا غصب وغیرہ) سے حاصل کی گئی ہو، تو اس کا تدارک صرف یہی ہے کہ وہ مال اس کے اصل مالک یا وارث کو واپس کیا جائے، اگر اصل

مالک یا وارث معلوم نہ ہو تو اس کو صدقہ کر دیا جائے بغیر کسی نیتِ ثواب کے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب ''الفتاوی الہندیہ'' میں ہے:

''من كان في يده مال حرام وأراد التوبة يجب عليه أن يصرفه إلى مالكه إن كان مالكه معلومًا، فإن لم يكن معلومًا فيجب صرفه إلى الفقراء والمساكين ولا يجوز له الانتفاع به بحالٍ من الأحوال'' (الفتاوی الہندیہ، کتاب الکسب، الباب الخامس، ج۳، ص ۴۰۳)

اسی طرح ''ردالمحتار'' میں ہے:

''ما أخذ بمعصية الله تعالى وجب صرفه إلى مالكه، فإن لم يعلم يصرف للفقراء تخلصًا لا على وجه التصدق'' (ردالمحتار، کتاب الغصب، ج۶، ص ۴۲۶)

یہ اصول اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حرام مال کا اپنی ذات کے لیے استعمال جائز نہیں ہے اور اس کو حلال بنانے کے لیے توبہ کے ساتھ ساتھ شرعی طریقے سے اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

حرام مال کو مالک خود بطورِ قرض استعمال کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: (7)

ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے لیکن تجارت کرنے کے لیے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو

اپنے اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرض کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:(7)

حرام مال کو کسی بھی صورت میں اپنی ذات پر استعمال کرنا یا اسے کسی کاروبار میں لگانا جائز نہیں ہے، چاہے وہ مال قرض کی شکل میں ہی کیوں نہ لیا جائے۔ حرام مال کے متعلق فقہ حنفی کی ہدایات یہ ہیں کہ اسے اصل مالک کو واپس کیا جائے، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو اس مال کو کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کر دینا لازم ہے، تاکہ مال پاک ہو جائے۔

تفصیل:

فقہاء کرام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حرام مال کو پاک کیے بغیر کسی بھی قسم کا نفع یا کاروبار کرنا جائز نہیں۔ امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا يحلّ له التصرّف في الحرام، سواء كان قليلًا أو كثيرًا، بل يجب عليه التخلّص منه بردّه إلى صاحبه إن عرفه، وإن لم يعرفه فيصرفه إلى الفقراء والمحتاجين" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الغصب، ج6،ص 391)

یعنی: حرام مال کو اپنے استعمال میں لانا یا اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کا مالک معلوم ہو تو اس کو واپس کرنا واجب ہے، اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقراء کو صدقہ کرنا لازم ہے۔

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں بیان ہوا:

"کل مال أخذ بغیر حقٍ یجب ردّہ إلی مالکہ إن کان معروفًا، فإن لم یکن، یجب صرفہ فی الخیرات" (الفتاویٰ الہندیۃ، ج5، ص434)

سوال کی صورت:

آپ نے ذکر کیا کہ حرام مال کو کاروبار کے لیے قرض لے کر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور بعد میں اصل رقم صدقہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اس طریقہ کار میں بھی یہ مال آپ کے ذمے باقی رہتا ہے، اور چونکہ یہ مال حرام ہے، اس لیے اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ہوگا۔ لہٰذا، آپ کو چاہیے کہ اس مال سے کاروبار کرنے کے بجائے اسے فوراً صدقہ کر دیں۔

اگر حلال قرض ملنے کا امکان نہیں ہے، تو یہ صبر کا مقام ہے۔ فقہ اسلامی میں رزقِ حلال کے حصول کی تاکید کی گئی ہے، اور حرام کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

"إن اللہ طیب لا یقبل إلا طیباً" (صحیح مسلم، حدیث: 1015)

یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاک مال ہی کو قبول کرتے ہیں۔

خلاصہ:

حرام مال کو کسی بھی قسم کے استعمال میں لانا جائز نہیں، اور اس سے کاروبار کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس مال کو فوراً صدقہ کرنا لازم ہے، تاکہ آپ اس سے

بری الذمہ ہوسکیں۔تجارت کے لیےصرف حلال ذرائع اختیار کریں، چاہےاس میں دشواری ہی کیوں نہ ہو۔

آدھامال حرام ہواورآدھاحلال تواس سےمزدوری لینے کاحکم

سوال:(8)

ایک آدمی کا کاروبارادھاحلال ہے؛اورآدھاحرام ہے:اب اس میں کام کرنے والےکوکبھی کبھی دونوں حصے کا کام کرنا پڑتا ہے؛ جیسےکبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے؛ یادونوں کے لیےلین دین کرنا پڑتا ہے؛ یادونوں کی وصولی کے لیے جانا پڑتا ہے۔

جواب:(8)

شریعت مطہرہ میں حلال اورحرام کی تفریق ضروری ہے۔ اگرکسی شخص کا کاروبارنصف حلال اورنصف حرام ہو،تو اس کے ساتھ تعاون کرنے اور کام کرنے کے سلسلے میں شریعت کا عمومی اصول یہ ہے کہ حرام کام میں کسی قسم کا تعاون کرنا شرعاً ناجائزاورگناہ ہے۔قرآن مجید میں واضح ارشادہے:

”وَلَاتَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (سورۂ مائدہ:2)

یعنی گناہ اورزیادتی کےکاموں میں ایک دوسرے کی مددنہ کرو۔

مسئلے کی وضاحت:

اگر کام کرنے والے کو دونوں حصوں یعنی حلال اور حرام کے کاموں میں مشغول ہونا پڑے، تو درج ذیل امور پر غور کیا جائے گا:

ا-صرف حلال کام:

اگر ملازم صرف حلال امور میں مشغول ہو اور حرام کام سے اجتناب کرے، تو اس کا کام کرنا اور اجرت لینا جائز ہوگا۔

۲-دونوں میں مشغولیت:

اگر ملازم کو حلال و حرام دونوں کے کام کرنے پڑتے ہیں، جیسے حساب کتاب، لین دین، یا وصولی وغیرہ، تو اس کا یہ کام ناجائز تعاون کے زمرے میں آئے گا، کیونکہ وہ حرام کام کے سلسلے میں بھی سہولت فراہم کر رہا ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالہ:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' میں لکھا ہے:

''**من أعان على معصيةٍ ولو بإشارةٍ فهو آثم**'' (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 5، صفحہ 263)

یعنی جو شخص کسی گناہ پر تعاون کرے، خواہ وہ اشارے کے ذریعے ہو، وہ گناہ گار ہوگا۔

اسی طرح ''ردالمحتار'' میں لکھا گیا ہے:

''کل ما کان إعانةً علی الحرام فهو حرام'' (ردالمحتار، جلد 9، صفحہ 514)

یعنی ہر وہ عمل جو حرام میں معاون ہو، وہ خود بھی حرام ہوگا۔

حکم:

مذکورہ صورت میں ملازم کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف حلال کاموں تک محدود رہے اور حرام امور میں کسی قسم کا تعاون نہ کرے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو اور حرام امور سے اجتناب نہ کر سکے، تو ایسی ملازمت کو ترک کرنا واجب ہے، تاکہ حرام کام کے گناہ سے بچا جا سکے۔

حرام کمائی سے حاصل کردہ زمین سے نفع اٹھانے کا حکم

سوال: (9)

حرام کمائی سے خرید کی ہوئی جائداد میں کام کرنے جیسے کھیتی باڑی کا کیا حکم ہے؟ اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا کیا حکم ہے؟ یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا ہے؟ نیز حرام کمائی کرنے والا آدمی اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرادے تو ان سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟

جواب:(9)

۱-حرام کمائی کی جائداد میں کام کرنا:

حرام کمائی سے خریدی گئی جائداد میں کھیتی باڑی کرنا یا کوئی بھی کام کرنا جائز نہیں، کیونکہ حرام مال میں نفع حاصل کرنا شرعاً ممنوع ہے۔البتہ اگر جائداد کسی حلال طریقے سے حاصل کی گئی ہو،تو اس میں کام کرنا جائز ہوگا۔فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ حرام کمائی سے بنی چیز میں استفادہ کرنا یا اس سے کسی بھی قسم کا نفع اٹھانا ناجائز ہے۔

۲-حرام کمائی والے کے گھر میں نوکری:

حرام کمائی والے کے گھر میں نوکری کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس کی تنخواہ اور خرچ حرام کمائی سے ہوگا، جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔اس سلسلے میں حدیث پاک میں ہے:

"**إن الله لا يقبل إلا طيباً**" (صحیح مسلم:1015)

یعنی اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ مال کو قبول کرتا ہے۔

۳-حرام کمائی والے کے ساتھ سفر:

حرام کمائی والے کی بائک یا کار میں سفر کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعے حرام مال سے نفع اٹھانا پایا جارہا ہے۔البتہ اگر مجبوری ہو یا کوئی اور متبادل نہ ہو،تو عارضی طور پر جائز ہے،لیکن دل میں کراہت رکھنی چاہیے اور اس سے

دور رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۴-حرام کمائی والے سے فیس وصولی:

حرام کمائی کرنے والا آدمی اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے اور فیس ادا کرے، تو اس فیس کو لینا جائز ہے، کیونکہ یہ ادارے کی خدمات کے عوض ادا کی جاتی ہے اور یہ ادارہ اس مال کو عام فلاحی کاموں میں خرچ کرے گا۔ البتہ اگر یقین ہو کہ یہ مال خالص حرام ہے، تو بہتر یہی ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے۔

فقہ حنفی کی کتب سے حوالہ جات:

۱-''الدر المختار'' میں ہے:

''لا یجوز الانتفاع بالمغصوب والمأخوذ بغیر حق'' (الدر المختار، جلد 6، صفحہ 507)

۲-علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

''إذا علم أن المال حرام فیحرم الانتفاع به مطلقاً'' (رد المحتار، جلد 6، صفحہ 385)

نتیجہ:

حرام کمائی سے حاصل کی گئی کسی بھی چیز میں کام کرنا یا نفع اٹھانا ناجائز ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حلال اور پاکیزہ کمائی سے اپنی زندگی کے معاملات چلائیں۔

کارپوریشن سے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم دینے کا حکم

سوال:(10)

آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے؟ کیا اس میں سود کی رقم کا استعمال جائز ہے؟

جواب:(10)

رشوت دینا اور لینا دونوں اسلام میں حرام اور گناہ کبیرہ ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے، لینے والے اور اس میں ثالث بننے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ رشوت کا لین دین کسی بھی حال میں جائز نہیں، حتی کہ جائز حق حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت دینا شریعت کے نزدیک معیوب عمل ہے، البتہ اگر کسی کا جائز حق دبایا جا رہا ہو اور بغیر رشوت کے وہ حق ملنا ممکن نہ ہو، تو مضطراً صرف اپنی ضرورت کے مطابق رشوت دینا معاف ہوگا، لیکن دینے والا گناہ سے بری الذمہ ہوگا، جبکہ لینے والا اور نظام برقرار رکھنے والے بدستور گناہگار ہوں گے۔

رہی بات رشوت میں سود کی رقم کے استعمال کی، تو فقہ حنفی کی رو سے سود کی رقم کسی جائز اور مباح کام میں خرچ کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ سود بذاتِ خود حرام

ہے۔ البتہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ سود کی رقم کو بلا نیتِ ثواب کسی ایسی جگہ پر خرچ کیا جائے جہاں سے نہ کسی کی ملکیت بڑھ رہی ہو اور نہ کسی عبادت کی نیت ہو، مثلاً ضرورت مند فقرا کو دینا، یا رفاہی کاموں میں لگا دینا۔ رشوت چونکہ حرام ہے، اس لیے اس میں سود کی رقم کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ حرام کو مزید تقویت دینے کے مترادف ہے۔

مراجع فقہ حنفی:

''الدر المختار مع رد المحتار'':

''الرشوة حرام مطلقاً فی کل ما فیها فساد حق أو إبطال باطل أو التوصل إلی ما لا یستحقه'' (کتاب الحظر والإباحة، باب الرشوة)

۲۔ ''بدائع الصنائع'':

''أما الربا فهو محرم شرعاً ...لا یجوز استعماله إلا فی وجه الضرورة حیث لا یُتوصل إلا به'' (کتاب البیوع، باب الربا)

خلاصہ:

یہ ہے کہ مدارس یا کسی بھی عمارت کے نقشے کی منظوری کے لیے رشوت دینا درست نہیں، اور اس میں سود کی رقم کا استعمال تو بدرجہ اولیٰ ناجائز ہے۔ اس عمل سے ہر ممکن حد تک اجتناب کرنا ضروری ہے، اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرنی چاہیے۔

جس بستی کے اکثر لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہوں ان کے ہدیہ کا حکم

سوال:(11)

کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؛ ناگواری اور اختلاف کا سبب بنتا ہے؛ تو کیا پوچھے بغیر یہ ہدیہ قبول کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ اس کا حرام ہونے کا بھی امکان ہے ؛اسی طرح بچوں کو کوئی ٹافی وغیرہ دے دیتا ہو؛ کبھی پانی چائے پلاتا ہو؛ اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو؛ لیکن اس شخص کی کمائی کیسی ہے معلوم نہیں؛ ایسی صورت میں اس چیز کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

جواب:(11)

ایسی صورت میں جب کسی شخص کے مال کے حلال یا حرام ہونے کا علم نہ ہو، اور غالب گمان یہ ہو کہ اس کی آمدنی مشکوک ہے، تو اس کے ہدیہ یا تحفے کو قبول کرنے کا حکم درج ذیل اصولوں پر مبنی ہوگا:

ا- حلال اور حرام کے اختلاط کا حکم:

فقہاء نے وضاحت فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کے مال میں حلال اور حرام کا

اختلاط ہو، لیکن حرام کا غلبہ نہ ہو، تو اس کے ہدیہ کو قبول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ حرام کا پہلو غالب نہ ہو۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب درمختار میں ذکر کیا گیا ہے:

"وَإِذَا خَالَطَ مَالُهُ الْحَلَالَ وَالْحَرَامَ فَلَا بَأْسَ بِأَكْلِهِ مَا لَمْ يَغْلِبِ الْحَرَامُ" (درمختار، کتاب البیوع)

۲-سوال پوچھنے کی ضرورت:

اگر سوال کرنے سے ناگواری یا فتنے کا خطرہ ہو، تو سوال نہ کرنا بہتر ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ اگر کسی کا ظاہر حال اچھا ہو، تو اس کے مال کے بارے میں بدگمانی نہیں کرنی چاہیے، جب تک کہ واضح دلیل نہ ہو کہ اس کی آمدنی حرام ہے۔

۳-بچوں کو ٹافی وغیرہ دینے کا مسئلہ:

بچوں کو دی گئی چیزیں معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان میں عام طور پر سختی نہیں کی جاتی۔ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ معمولی چیزیں (جیسے ٹافی، چائے، یا چھوٹے تحائف) قبول کرنے میں نرمی کا پہلو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ حکم:

اگر دینے والے کی آمدنی کے بارے میں یقینی علم نہ ہو کہ وہ حرام ذرائع سے ہے، تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، خاص طور پر جب سوال کرنے سے اختلاف یا دل آزاری ہو۔

البتہ اگر یقین ہو جائے کہ اس کی کمائی کا اکثر حصہ حرام ہے، تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

بچوں کو دی گئی معمولی چیزیں (جیسے ٹافی یا چھوٹے تحائف) قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب تک کہ ان کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو۔

جس کی کمائی حرام ہو اس کے لئے دعاء کا حکم

سوال:(12)

جس کا مال یا کمائی حرام ہے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی؛ اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر؛ یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے؛ یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے؛ تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:(12)

حرام مال یا حرام کمائی کی نحوست انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالتی ہے، اور حرام ذرائع سے کمائی کی جانے والی دولت دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"**إن الله طيب لا يقبل إلا طيباً**" (صحیح مسلم:1015)

یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیز کو قبول کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء: يا رب يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذى بالحرام، فأنى يستجاب له؟" (صحیح مسلم:1015)

یعنی اگر کسی کا کھانا، پینا، لباس اور پرورش حرام مال سے ہو تو اس کی دعا قبول کیسے ہو سکتی ہے؟

حرام کمانے والے کا دعا کرانا یا دم کروانا:

فقہائے کرام نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص حرام مال سے کماتا ہے، تو اس کی اپنی دعا میں تاثیر کم ہو سکتی ہے، لیکن اگر وہ کسی دوسرے صالح اور متقی شخص سے دعا کرواتا ہے یا پانی پر دم کرنے کا کہتا ہے، تو یہ جائز ہے۔ اس لیے کہ دعا کا اثر دعا کرنے والے کے اخلاص اور اللہ کے فضل پر منحصر ہوتا ہے۔

فقہ حنفی میں اصول:

فقہ حنفی کی معتبر کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں ذکر کیا گیا ہے:

"الدعاء من العبادات، والقبول بيد الله تعالى، سواء كان الداعي صالحاً أو فاسقاً" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 335)

یعنی دعا ایک عبادت ہے، اور اس کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے،

چاہے دعا کرنے والا نیک ہو یا گناہگار۔

حکم:

حرام کمانے والے شخص کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ حرام مال سے توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی اصلاح کی دعا کرے۔تاہم اگر وہ اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر کسی متقی اور صالح شخص سے دعا کرواتا ہے، یا کسی سے پانی پر دم کرواتا ہے،تو یہ شرعاً جائز ہے۔لیکن اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال کو پاک کرے اور حلال ذرائع اختیار کرے تاکہ اس کی عبادات اور دعاؤں میں برکت آئے۔

سونے کی خرید و فروخت اور تبادلے کی بعض صورتوں کی تنقیح

سونے کا خریدار ماہانہ قسطوں میں رقم جمع کرتا ہے اور بعد میں اتنی رقم کا سونا لیتا ہے، کیا حکم ہے؟

سوال: 1 (الف)

الف: خریدار سونے کے تاجر کے پاس ماہانہ ۱۰ ہزار روپے کے حساب سے گیارہ ماہ تک ایک لاکھ دس ہزار روپے جمع کرتا ہے، یہ رقم تاجر اپنے استعمال میں لاتا ہے اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ گیارہ ماہ کے بعد اس وقت کی بازاری قیمت کے اعتبار سے گاہک اتنی مالیت یعنی ایک لاکھ دس ہزار روپے کا زیور خرید لے گا اور اس سے بنوائی (میکنگ چارج) الگ سے نہیں لی جائے گی

جواب: 1 (الف)

آپ کے سوال کا جواب فقہ حنفی اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں سونے کی خرید و فروخت اور اس کا تبادلہ درج ذیل پہلوؤں سے شریعت کے اصولوں پر پرکھا جائے گا:

۱-سونے کی خریداری اور نقد وقبضہ کا معاملہ

فقہ حنفی کے مطابق، سونے (چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو یا خام سونے کی شکل میں) کی خرید وفروخت صرف اسی وقت جائز ہے جب معاملہ مجلسِ عقد میں نقد اور قبضے کے ساتھ انجام پائے۔

موخرادائیگی یا موخرقبضہ(Deferred Payment or Delivery) اس میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بیعِ صرف (کرنسی یا قیمتی دھاتوں کی خرید وفروخت) میں شامل ہے، اور بیع صرف میں ''یداً بید'' (نقد اور فوراً قبضہ) شرط ہے۔

حوالہ:1

قال فی الدر المختار:

"لا بد من التقابض في المجلس في الصرف و الذهب بالذهب و الفضة بالفضة" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب البیوع، باب الصرف، دار الفکر، ج5، ص194)

ترجمہ: بیعِ صرف (کرنسی یا قیمتی دھاتوں کی خرید وفروخت) میں مجلسِ عقد میں فوراً قبضہ ہونا ضروری ہے۔

۲-معاہدہ کے تحت رقم جمع کرنا اور سود کا شبہ:

اگر خریدار ماہانہ قسطوں میں رقم جمع کر رہا ہے اور یہ رقم تاجر استعمال کر رہا ہے تو اس میں سود کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ شریعت میں کوئی بھی ایسا معاملہ جائز نہیں جس میں

قرض پرکوئی شرطی نفع (Conditional Benefit) حاصل ہو۔

حوالہ:2

قال فی الھدایۃ:

”**وکل قرض جر نفعاً فھو ربا**“ (الہدایۃ، کتاب البیوع، باب الربا، دار احیاء التراث العربی، ج3،ص52)

ترجمہ: ہر وہ قرض جو نفع کھینچے، وہ سود ہے۔

۳-بنائی (میکنگ چارجز) کا معاملہ:

اگر معاہدہ میں یہ شرط ہے کہ زیور خریدنے پر بنائی (میکنگ چارجز) نہیں لیا جائے گا، تو یہ بھی قرض کے عوض ایک اضافی فائدہ تصور ہوگا، جوسود کے دائرے میں آتا ہے۔

حوالہ:3

قال ابن عابدین شامی:

”**لا یجوز اشتراط المنفعة فی القرض لأنه یصیر ربا**“ (ردالمحتار، کتاب البیوع، باب القرض، دار الفکر، ج5،ص156)

ترجمہ: قرض پر منفعت کی شرط جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سود بن جا تا ہے۔

۴-معاہدے میں تاخیر کے ساتھ خریداری کا مسئلہ:

گیارہ ماہ کے بعد سونے کی خریداری کرنا، اور اس وقت کی قیمت کے مطابق زیور حاصل کرنا، یہ شریعت کے اس اصول سے متصادم ہے کہ کسی بھی معاملہ میں قیمت اور مقدار دونوں معین ہونا ضروری ہیں۔

حوالہ:4

قال فی فتح القدیر:

"**کل بیع فیه الجهالة فهو فاسد**"(فتح القدیر، کتاب البیوع، دار الفکر، ج4،ص103)

ترجمہ: ہر وہ بیع جس میں جہالت (عدم تعیین) ہو، وہ فاسد ہے۔

۵-شرعی متبادل:

مذکورہ صورت میں بہتر یہ ہے کہ گاہک ایک مخصوص مقدار میں سونا فوراً خرید لے اور اسے اپنے قبضے میں لے۔ اگر ماہانہ قسطوں میں خریداری کرنی ہو تو ہر قسط کے ساتھ معاہدہ دوبارہ کیا جائے اور اس وقت کی قیمت پر سونا خرید کر قبضہ میں لیا جائے۔

حوالہ:5

قال فی البخاری:

"**من ابتاع طعاماً فلا یبیعه حتی یستوفیه**" (صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب بیع الطعام، رقم الحدیث:2132)

ترجمہ: جو کوئی غلہ خریدے، وہ اسے آگے فروخت نہ کرے جب تک کہ اسے مکمل قبضے میں نہ لے لے۔

نتیجہ:

مذکورہ معاملہ شرعی اصولوں کی روشنی میں جائز نہیں ہے کیونکہ:

۱-بیعِ صرف میں نقد اور قبضہ ضروری ہے۔

۲-معاہدہ میں قرض پر نفع (سود) کا شبہ پایا جاتا ہے۔

۳-قیمت اور مقدار کی تعیین کے بغیر معاہدہ فاسد ہے۔

۴-بنائی چارجز نہ لینے کی شرط، قرض پر نفع کے مترادف ہے۔

خریدار کا گیارہ ماہ تک رقم جمع کرنا پھر اتنی مقدار کا زیور یا نقد لینے کا حکم

سوال:1(ب)

بعض سونے کے تاجروں نے اس میں یہ بھی شامل کیا ہے کہ جب گیارہ ماہ مکمل ہو جائیں تو وہ اپنے نام پر جمع شدہ زیور لینا چاہے تو زیور لے لے، یا موجودہ ریٹ کے حساب سے اُس کی قیمت لے لے تو اس طریقے پر زیور خریدنے کا شرعی حکم

کیا ہوگا؟ اور اگر زیور لینے کے بجائے روپیہ لیا جائے (جو جمع کردہ روپیہ سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے) تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: 1 (ب)

سونے کے زیورات خریدنے اور اس پر گیارہ ماہ مکمل ہونے پر زیور واپس لینے یا موجودہ ریٹ کے حساب سے قیمت لینے کے معاملے میں شرعی حکم کو سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات کو واضح کرنا ضروری ہے:

۱-معاہدے کی نوعیت:

اس صورت میں یہ معاہدہ ایک طرح کا ادھار یا سرمایہ کاری پر مبنی ہے، جہاں زیور جمع کرایا جاتا ہے اور خریدار کے پاس دو آپشنز ہوتے ہیں:

زیور لینا: یعنی اصل مال یا اس کا بدل لینا۔

موجودہ ریٹ پر قیمت لینا: جو جمع شدہ رقم سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

۲-سونے کی بیع اور ربا کا مسئلہ

شرعی اصول کے مطابق سونے اور چاندی کی خرید و فروخت یداً بید (ہاتھوں ہاتھ) ہونی چاہیے، اور اس میں کمی یا زیادتی ربا (سود) کے زمرے میں آتی ہے، جیسا

کہ حدیث میں ہے:

"عن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، مثلاً بمثل، يداً بيد، فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد" (صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذہب بالورق نقداً)

۳-شرعی موقف اور فقہ حنفی کی روشنی میں تحقیق:

فقہ حنفی میں سونے اور چاندی کی بیع کے متعلق خاص اصول ہیں، جن کی روشنی میں درج ذیل کتب سے عبارات پیش کی جارہی ہیں:

۱-ہدایہ

"وإن بيع الذهب بالذهب أو الفضة بالفضة يشترط فيه شرطان: التساوی فی الوزن والتقابض فی المجلس" (الہدایہ، کتاب البیوع، باب الصرف، دار احیاء التراث العربی، جلد 3، صفحہ 47)

ترجمہ: اگر سونے کو سونے کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے بیچا جائے تو دو شرطیں ہیں: وزن میں برابری اور مجلس میں قبضہ۔

۲-الدر المختار:

(وفی الصرف) وهو بيع أحد النقدين بالآخر (شرط) زائد عن شروط البيع (قبضهما فی المجلس) (الدر المختار، کتاب البیوع، باب الصرف، دار الفکر، جلد 5، صفحہ 167)

ترجمہ:صرافی کے معاملے میں (یعنی نقد کی خرید وفروخت میں) شرط ہے کہ مجلس میں دونوں کا قبضہ ہو۔

۳-فتاوی عالمگیری:

"إذا باع الذهب بالذهب أو بالفضة فإنه يشترط التقابض فی المجلس، ولا يجوز التأخير" (الفتاوی الہندیہ، کتاب البیوع، باب الصرف، دار الفکر، جلد 3، صفحہ 112)

ترجمہ: اگر سونے کو سونے یا چاندی کے بدلے فروخت کیا جائے تو مجلس میں قبضہ ضروری ہے، اور تاخیر جائز نہیں۔

۴-بدائع الصنائع:

"وأما شرط التقابض فلأن العقد متی خلا عن شرط التساوی وزيادة القبض يكون رباً" (بدائع الصنائع، کتاب البیوع، باب الصرف، دار الکتب العلمیۃ، جلد 5، صفحہ 190)

ترجمہ: قبضہ کی شرط اس لیے ہے کہ اگر معاہدے میں برابری اور قبضہ کی شرط نہ ہو تو یہ سود ہوگا۔

۵-البحر الرائق:

"يشترط التماثل فی الجنس الواحد، والتقابض فی المجلس، وإلا كان العقد ربا" (البحر الرائق، کتاب البیوع، باب الصرف، دار الکتب العلمیہ، جلد 6، صفحہ 110)

ترجمہ: ایک ہی جنس میں برابری اور مجلس میں قبضہ شرط ہے، ورنہ معاہدہ

سود ہوگا۔

۴-موجودہ معاملے کا شرعی حکم:

زیور لینا: اگر خریدار گیارہ ماہ کے بعد زیور ہی واپس لیتا ہے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ معاہدہ میں کسی قسم کی زیادتی یا شرط نہ ہو۔

موجودہ ریٹ کے مطابق قیمت لینا: یہ سود کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ یہ سونے کی خرید وفروخت میں برابری اور مجلس میں قبضہ کی شرائط کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

نتیجہ:

مذکورہ معاہدے میں موجودہ ریٹ کے مطابق قیمت لینا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ ربا (سود) میں شمار ہوگا۔ صرف وہی صورت جائز ہے جہاں اصل زیور کو ہی واپس لیا جائے۔

خریدار گیارہ ماہ تک قسط جمع کرتا ہے اخیر میں وہ زیور لیتا ہے، اس کا حکم

سوال:2(الف)

خریدار ہر ماہ دس ہزار روپئے کے حساب سے گیارہ ماہ تک ایک لاکھ دس

ہزار روپئے جمع کرتا رہتا ہے اور ہر قسط کے ساتھ اس ماہ کی بازاری قیمت کے اعتبار سے اتنے پیسوں کا زیور اُس کے نام لکھا جاتا رہتا ہے، جب گیارہ ماہ مکمل ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے نام پر درج شدہ وزن کے بقدر زیور لے لیتا ہے اور اس سے بنوائی کی اجرت نہیں لی جاتی۔

جواب:2(الف)

آپ کے سوال میں بیان کردہ معاملہ کی حیثیت ایک خاص نوعیت کے خرید وفروخت کے معاہدے کی ہے، جس میں قسط وار ادائیگی کے ساتھ زیور کے وزن کا تعین ماہ بہ ماہ کیا جاتا ہے اور آخری قسط کی ادائیگی پر زیور حوالے کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو اسلامی شریعت کی روشنی میں درج ذیل اصولوں پر پرکھنا ضروری ہے:

۱-معاہدے میں قیمت کی تعیین:

اسلامی شریعت میں خرید وفروخت کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ مال کی قیمت اور مقدار واضح ہو۔ معاہدے میں مبہم قیمت یا مقدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ غرر (دھوکہ) کے زمرے میں آتا ہے، جو کہ ناجائز ہے۔

۲-قسط وار ادائیگی کا حکم:

قسط وار خرید وفروخت جائز ہے، بشرطیکہ معاہدہ کے وقت مال کی قیمت اور

اقساط کی تفصیلات واضح ہوں۔

۳-زیور کی بنوائی کی اجرت:

اگر زیور بنانے کی اجرت خریدار سے وصول نہیں کی جاتی تو یہ معاملہ ہبہ یا تحفہ کے زمرے میں آ سکتا ہے، لیکن یہ شرط خرید وفروخت کے معاہدے پر اثر انداز نہ ہو، ورنہ یہ شرعاً مشروط بیع کے زمرے میں آئے گا، جو کہ مکروہ ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں سے مستند حوالے:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

"وَإِذَا بَاعَ شَيْئًا وَشَرَطَ شَرْطًا فَالشَّرْطُ بَاطِلٌ وَالْبَيْعُ جَائِزٌ إِلَّا أَنْ يَكُونَ الشَّرْطُ مَا يَنْفَعُ فِي الْبَيْعِ" (جلد:4، صفحہ:433، دار الفکر، باب الشروط فی البیوع)

ترجمہ: جب کوئی شخص کسی چیز کو بیچے اور کوئی شرط لگائے تو شرط باطل ہوگی لیکن بیع جائز رہے گی، بشرطیکہ شرط ایسی نہ ہو جو بیع کے لیے نفع بخش ہو۔

۲-الہدایہ:

"وَالْبَيْعُ يَفْسُدُ بِعَدَمِ تَعْيِينِ الثَّمَنِ فِي الْعَقْدِ، لِأَنَّ الْمَبِيعَ مَعْلُومٌ وَالثَّمَنَ مَجْهُولٌ، وَذَلِكَ مَجَالٌ لِلْغَرَرِ" (جلد:2، صفحہ:58، دار الکتب العلمیہ، کتاب البیوع)

ترجمہ: بیع اس وقت فاسد ہوگی جب عقد میں قیمت متعین نہ ہو، کیونکہ مبیع معلوم اور ثمن مجہول ہو تو یہ دھوکہ دہی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۳-بدائع الصنائع:

"**وَلَا بُدَّ فِي الْبَيْعِ مِنْ تَعْيِينِ الثَّمَنِ وَالْمُثْمَنِ، لِأَنَّ الْجَهَالَةَ تُفْسِدُ الْعُقُودَ**" (جلد:5،صفحہ:134،دارالکتب العلمیہ،کتاب البیوع)

ترجمہ: بیع میں قیمت اور مبیع کی تعیین ضروری ہے، کیونکہ جہالت (ابہام) معاملات کو فاسد کردیتی ہے۔

۴-المبسوط للسرخسی:

"**إِذَا تَعَيَّنَ الثَّمَنُ وَالْمَبِيعُ فِي الْعَقْدِ جَازَ الْبَيْعُ، وَإِنْ كَانَ فِي الثَّمَنِ غَرَرٌ لَمْ يَجُزْ**" (جلد:13،صفحہ:8،دارالمعرفہ،کتاب البیوع)

ترجمہ: جب عقد میں قیمت اور مبیع متعین ہوتو بیع جائز ہوگی،لیکن اگر قیمت میں غرر ہوتو جائز نہ ہوگی۔

۵-فتح القدیر:

"**وَكُلُّ مَا يَدْخُلُ فِيهِ الْغَرَرُ أَوْ الْجَهَالَةُ فِي الْعَقْدِ فَهُوَ غَيْرُ جَائِزٍ**" (جلد:6،صفحہ:435،دارالکتب العلمیہ،کتاب البیوع)

ترجمہ: ہر وہ معاملہ جس میں غرر یا جہالت (ابہام) شامل ہو، وہ عقد جائز نہیں ہوگا۔

جواب کا خلاصہ:

سوال میں ذکرکردہ معاملہ میں اگر:

۱-ہر قسط کے ساتھ زیور کے وزن اور قیمت کا تعین واضح طور پر ہورہا ہے۔

۲-کوئی اضافی شرط، جیسے بنوائی کی اجرت معاف کرنا، معاہدہ کا حصہ نہ بنے۔
تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہوگا۔ لیکن اگر کسی قسم کی جہالت یا غرر موجود ہو، تو یہ معاہدہ ناجائز ہوگا۔

قسط وار ایک لاکھ دس ہزار جمع کرانے کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار کا سونا لینے کا حکم

سوال:2(ب)

اس اسکیم میں بسا اوقات سونے کے تاجر کی طرف سے خریدار کو یہ اختیار بھی ملتا ہے کہ وہ اس وقت کی بازاری قیمت کے اعتبار سے ایک لاکھ دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا سونا لے لے مگر اس صورت میں بنوائی کی اجرت خریدار پر حسب دستور لازم ہوگی تو اب سوال یہ ہے کہ قسط وار رقم ادا کرکے آئندہ کی تاریخ میں خریداری کرنے کے معاہدے کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ نیز بنوائی کی رعایت کا فائدہ اٹھانا یا ایک لاکھ دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا سونا حاصل کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور اس پورے معاملے کی فقہی تطبیق کیا ہوگی؟

جواب:2(ب)

سوال میں مذکور معاملے کے تین اہم پہلو ہیں جن پر فقہی بحث ضروری ہے:

۱-قسط وار رقم کی ادائیگی کے ساتھ آئندہ تاریخ میں خریداری کا معاہدہ

۲-بنوائی کی اجرت کا ذمہ خریدار پر ڈالنا

۳-بازاری قیمت کے فرق کے اعتبار سے سونا لینا (ایک لاکھ دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ بیس ہزار)

پہلا پہلو: قسط وار ادائیگی اور خریداری:

شریعت میں قسطوں پر خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ معاملہ شفاف ہو اور قیمت متعین ہو۔ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ معاملہ کی کوئی شرط ایسی نہ ہو جو جہالت یا غرر کا سبب بنے۔ اگر سونا آئندہ تاریخ میں فراہم کیا جائے تو یہ بیع سلم کہلائے گی، جس کے لیے مال کی مقدار، معیار، اور وقت کی مکمل وضاحت ضروری ہے۔

دلائل:

۱-علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَشَرْطُ صِحَّةِ السَّلَمِ أَنْ يَكُونَ الْمَبِيعُ مَوْصُوفًا فِي الذِّمَّةِ مَعْلُومًا بِالْوَصْفِ الْمُوجِبِ لِرَفْعِ النِّزَاعِ" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 489، مطبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

۲-علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَالسَّلَمُ لَا يَصِحُّ إِلَّا إِذَا كَانَ الثَّمَنُ مَعْلُومًا وَالْمُسْلَمُ فِيهِ مَوْصُوفًا فِي الذِّمَّةِ مَعْلُومًا بِالْوَصْفِ" (الہدایہ، جلد 3، صفحہ 47، مطبع دار الکتب العربیہ)

لہٰذا قسطوں پر بیع جائز ہے بشرطیکہ قیمت اور مال کی تفصیلات واضح ہوں۔

دوسرا پہلو: بنوائی کی اجرت:

اگر بنوائی کی اجرت خریدار پر لازم کی جائے، تو یہ اجرت الگ معاملہ ہوگا۔ فقہ حنفی کے اصول کے مطابق کسی بیع میں ایسی شرط جو بیع کے علاوہ کسی اور معاملے کو لازم کرے، وہ شرط فاسد ہوگی۔

دلائل:

۱- علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"كُلُّ شَرْطٍ يُفْسِدُ الْعَقْدَ هُوَ مَا لَا يُوجِبُهُ الْعَقْدُ وَلَا يَقْتَضِيهِ" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 110، مطبع دار الفکر بیروت)

تیسرا پہلو: قیمت میں فرق کا معاملہ:

اگر خریدار کو اختیار دیا جائے کہ وہ قیمت کے فرق کے مطابق سونا لے، تو یہ شرط فقہ حنفی میں سود کی صورت میں آتی ہے، کیونکہ شریعت میں زیورات کی بیع میں تفاضل (فرق) اور نسیئہ دونوں ممنوع ہیں۔

دلائل:

۱-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

"نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَعَنْ بَيْعِ الْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 2175)

۲-امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ لَا يَجُوزُ فِيهِ التَّفَاضُلُ" (المبسوط، جلد 12، صفحہ 103، مطبع دار المعرفۃ بیروت)

فقہی تطبیق:

۱-قسطوں پر خریداری جائز ہے، بشرطیکہ تمام شرائط واضح ہوں اور کسی قسم کا غرر یا جہالت نہ ہو۔

۲-بنوائی کی اجرت خریدار پر ڈالنا علیحدہ معاہدہ کے تحت ہو تو جائز ہے، بصورت دیگر شرط فاسد ہوگی۔

۳-قیمت کے فرق کے مطابق سونا لینا یا دینا سود کے زمرے میں آتا ہے، جو ناجائز ہے۔

نتیجہ:

یہ معاملہ کئی جہات سے شرعی اصولوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے، خصوصاً قیمت کے فرق اور شرطِ فاسد کے پہلو سے۔اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں۔

قسط وار پیسے جمع کروا کر قرعہ اندازی کے ذریعہ سونا دینے کا حکم

سوال:(3)

بعض علاقوں میں سونے کی کمیٹی ڈالی جاتی ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سونے کا تاجر سو لوگوں کو بیس مہینوں تک ایک ایک ہزار روپئے جمع کرنے کو کہتا ہے اور قرعہ اندازی کے ذریعہ ہر مہینے شرکاء میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے، جس کا انتخاب ہوجاتا ہے اس کو اسی مہینے میں ہزار روپئے کا سونا مل جاتا ہے۔ اسی طریقہ پر وہ ہر مہینے ایک ایک آدمی کا انتخاب کرتا ہے تو گویا کہ جس کا نام قرعہ اندازی میں سب سے پہلے آتا ہے اس کو ایک ہزار روپئے میں بیس ہزار کا سونا ملتا ہے اور جس کا دوسرے مہینے میں قرعہ اندازی میں نام آتا ہے، اس کو دو ہزار میں بیس ہزار کا سونا ملتا ہے الی آخرہ، یہاں تک کہ جس کا انیسویں مرتبہ میں نام آتا ہے، اس کو انیس ہزار میں بیس ہزار کا سونا ملتا ہے اور باقی ۸۱ شرکاء کو بیس ہزار ہی میں ۲۰ ہزار کا سونا ملتا ہے، سنار کا کہنا ہے کہ جو پہلے ۱۹ شرکاء کو ان کے جمع کردہ پیسوں سے زائد سونا مل رہا ہے وہ ہماری طرف سے انعام ہے۔ تو قابل تحقیق امر یہ ہے کہ اس کمیٹی میں شامل ہوکر فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟ اور اس کی فقہی تطبیق کیا ہوگی؟ کیا ثمن میں کمی یا انعام وغیرہ میں داخل ہوکر یہ معاملہ جواز کے دائرے میں آسکتا ہے؟ یا قمار وغیرہ میں داخل ہوکر ناجائز ہوگا؟

آج کل اس طرح کی اسکیمیں سونے کے علاوہ دیگر بہت سی چیزوں میں بھی

چلائی جارہی ہیں اس لئے نصوص شرعیہ کی روشنی میں سب مروجہ صورتوں کا تفصیلی جواب تحریر کیا جائے، اگر سونے اور دیگر چیزوں کے درمیان حکم میں کچھ فرق ہو تو اسے بھی واضح کیا جائے۔

جواب:(3)

آپ کے سوال میں بیان کردہ کمیٹی کا طریقہ کار تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد اس کا شرعی حکم درج ذیل نکات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے:

مسئلے کی فقہی حیثیت:

اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ شرکاء اپنے جمع شدہ پیسوں کے ذریعہ ایک طرح کا جوئے یا قمار کا معاملہ کرتے ہیں، کیونکہ فائدہ اور نقصان کا دارومدار محض قرعہ اندازی پر ہے۔ جس کا نام پہلے نکلتا ہے وہ کم قیمت میں زیادہ سونا حاصل کرتا ہے اور جس کا نام بعد میں نکلتا ہے، وہ قریب قریب مکمل قیمت ادا کرتا ہے۔

شریعت میں قمار کی حرمت:

قمار (جوا) کے حرام ہونے پر قرآن وسنت میں صریح نصوص موجود ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" (سورۃ المائدۃ:90)

ترجمہ: اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور قرعہ کے تیر سب گندے کام ہیں، شیطان کے کام ہیں، پس ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

معاملے کی شرعی تطبیق:

اس کمیٹی کی صورت میں درج ذیل شرعی خرابیاں موجود ہیں:

۱-قمار (جوا): قرعہ اندازی پر منحصر ہونا قمار کی صریح مثال ہے۔

۲-غرر (غیر یقینی خطرہ): شرکاء کے لیے یہ غیر یقینی ہوتا ہے کہ وہ کب اور کتنا فائدہ یا نقصان اٹھائیں گے۔

۳-فائدہ کا بلاعوض حصول: پہلے چند افراد کو اضافی سونا دیا جاتا ہے، جو کہ ''بلاعوض نفع'' کے زمرے میں آتا ہے، اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔

فقہ حنفی کے دلائل:

۱-حوالہ: 1 ردالمحتار

"وَكُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، صفحہ 43، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: ہر وہ قرض جو نفع لے کر آئے، وہ سود ہے۔

۲-حوالہ: 2 بدائع الصنائع:

"فَإِنَّ الْقِمَارَ يَدْخُلُ تَحْتَ بَابِ الْمَيْسِرِ الْمَنْهِيِّ عَنْهُ فِي الشَّرِيعَةِ"

(بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 206، مطبع دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: قمار ممانعت شدہ میسر میں شامل ہے، جس کی شریعت میں ممانعت ہے۔

۳-حوالہ: 3فتح القدیر:

"وَفِي الْقُرْعَةِ مَفْسَدَةُ التَّعْلِيقِ بِالْمَجْهُولِ وَذَلِكَ يَقْتَضِي الْبُطْلَانَ" (فتح القدیر، جلد 5، صفحہ 142، مطبع دار احیاء التراث)

ترجمہ: قرعہ اندازی میں مجہولیت کے ساتھ معاملہ مشروط کرنے کی خرابی ہے، اور یہ معاملہ باطل ہے۔

۴-حوالہ: 4المبسوط:

"وَالْبَيْعُ بِمَا فِيهِ غَرَرٌ لَا يَجُوزُ شَرْعًا" (المبسوط للسرخسی، جلد 13، صفحہ 19، مطبع دار المعارف)

ترجمہ: ہر وہ بیع جس میں غرر ہو، شرعاً جائز نہیں ہے۔

۵-حوالہ: 5الشرح الصغیر:

"وَكُلُّ مُعَامَلَةٍ يَغْلِبُ عَلَيْهَا الضَّرَرُ تُفْسَخُ" (الشرح الصغیر، جلد 3، صفحہ 205، مطبع دار المعارف)

ترجمہ: ہر وہ معاملہ جس میں نقصان کا غلبہ ہو، وہ فسخ کر دیا جائے گا۔

خلاصہ:

سونے کی کمیٹی یا دیگر اشیاء پر مبنی اسی طرح کی اسکیمیں شرعی طور پر ناجائز

ہیں، کیونکہ ان میں قمار، غرر، اور بلاعوض نفع شامل ہے۔اس لیے اس قسم کی کمیٹی میں شامل ہونے یا اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قسط مکمل ہونے کے بعد قیمت میں کمی زیادتی کے ساتھ سونا لینے کا حکم

سوال:(4)

اس اسکیم میں بسا اوقات سونے کے تاجر کی طرف سے خریدار کو یہ اختیار بھی ملتا ہے کہ وہ اس وقت کی بازاری قیمت کے اعتبار سے ایک لاکھ دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا سونا لے لے مگر اس صورت میں بنوائی کی اجرت خریدار پر حسب دستور لازم ہوگی تو اب سوال یہ ہے کہ قسط وار رقم ادا کر کے آئندہ کی تاریخ میں خریداری کرنے کے معاہدے کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ نیز بنوائی کی رعایت کا فائدہ اٹھانا یا ایک لاکھ دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا سونا حاصل کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور اس پورے معاملے کی فقہی تطبیق کیا ہوگی؟

جواب:(4)

یہ مسئلہ بنیادی طور پر ''سلم'' اور ''بیع التزامی'' کے اصولوں سے تعلق رکھتا ہے

،اور اس کی شرعی حیثیت کا تعین درج ذیل نکات کی روشنی میں کیا جائے گا:

۱-قسط وار خریداری اور مؤجل قیمت پر معاملہ:

قسط وار خریداری کی صورت میں، اگر قیمت اور معاہدے کی شرائط پہلے سے متعین ہوں اور دونوں فریقین کے درمیان مکمل شفافیت ہو، تو یہ معاملہ درست ہے۔

فقہ حنفی کی دلیل:

"وإذا وقع العقد على الثمن المؤجل ولم يكن فيه غرر ولا جهالة يصح العقد، لأن العقد يدل على الإلتزام من الطرفين" (الدر المختار، جلد 5، صفحہ 57، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: جب قیمت مؤجل ہو اور اس میں کسی قسم کا غرر یا جہالت نہ ہو، تو یہ عقد صحیح ہے؛ کیونکہ عقد طرفین کے درمیان التزام کو ظاہر کرتا ہے۔

۲-سونے کے وزن میں زیادتی (ایک لاکھ بیس ہزار کا سونا لینا):

یہ اختیار خریدار کو دینا کہ وہ اضافی قیمت دے کر زیادہ سونا لے، شرعی طور پر "بیع" کے اصولوں کے خلاف ہوگا، کیونکہ یہ ربا کے زمرے میں آتا ہے۔

فقہ حنفی کی دلیل:

"وإذا كان في العقد شرط يوجب زيادة أو نقصا في البدل، فإنه

یفسد العقد، لأن کل زیادة فی المال المحرم ربا" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 144، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: جب عقد میں کوئی ایسی شرط ہو جو بدل میں زیادتی یا کمی کا سبب بنے، تو عقد فاسد ہوگا، کیونکہ مال میں ہر زیادتی سود ہے۔

۳-بنوائی کی اجرت کی رعایت:

سونے کی بنوائی کی اجرت کا معاہدہ، اگر خریداری کے بعد الگ سے ہو، تو یہ درست ہوگا۔ لیکن اگر اس کا تعلق خریداری کی شرط سے جڑا ہو، تو یہ بھی عقد کو فاسد کر دے گا۔

فقہ حنفی کی دلیل:

"ولا یجوز أن یکون العمل شرطا فی عقد البیع؛ لأنه یؤدی إلی الغرر فی العقد" (فتح القدیر، جلد 7، صفحہ 205، دار الفکر)

ترجمہ: عقد بیع میں کام کو شرط بنانا جائز نہیں، کیونکہ یہ عقد میں غرر پیدا کرتا ہے۔

۴-اس پورے معاملے کی فقہی تطبیق:

یہ معاملہ "بیع عینہ" کے مشابہ ہوگا، جو فقہ حنفی میں ممنوع ہے۔

فقہ حنفی کی دلیل:

”وكل شرط يؤدي إلى الربا أو الغرر في البيوع، فالعقد غير جائز“

(المبسوط للسرخسی، جلد 13، صفحہ 40، مطبعہ دار المعارف بیروت)

ترجمہ: ہر وہ شرط جو بیع میں سود یا غرر پیدا کرے، عقد کو ناجائز بنا دیتی ہے۔

۵- مجموعی حکم:

۱- قسط وار خریداری جائز ہے بشرطیکہ قیمت اور دیگر شرائط واضح ہوں۔

۲- سونے کے وزن میں زیادتی کا اختیار دینا جائز نہیں؛ یہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔

۳- بنوائی کی اجرت کا معاہدہ، اگر بیع کے ساتھ مشروط نہ ہو، تو جائز ہے۔

۴- مذکورہ طریقہ کار کو موجودہ صورت میں اپنانا جائز نہیں؛ کیونکہ اس میں ربا اور غرر کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

پرانا سونا دے کر نیا سونا، لینا اس کی متعدد صورتوں کا حکم

سوال: (5)

اگر کوئی خریدار پرانے سونے کے زیور کو تبدیل کروا کر نئے سونے کا کوئی زیور لینا چاہتا ہے تو اُس کی متعدد صورتیں تاجروں کے یہاں رائج ہیں:

الف: خریدار کے پاس (مثلا) ۱۸ کیریٹ سونے کا پانچ تولے کا کوئی زیور ہے، پھر وہ پرانا زیور دے کر نیا زیور لینا چاہتا ہے تو تاجر اس شخص کو پرانے زیور کے بدلے میں ۱۸ کیریٹ ہی کے نئے سونے کے پورے پانچ تولے کا زیور ایک سال بعد دینے کا وعدہ کرتا ہے، اس دوران تاجر گاہک کے دیے ہوئے سونے کو اپنے کاروبار میں شامل کر کے فائدہ اٹھاتا ہے، یہی تاجر کا فائدہ ہے اور خریدار کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال بعد نیا سونا مل جاتا ہے، تو یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

جواب:(5)

آپ کے سوال میں بیان کردہ صورت کا تعلق بیع سلف اور ربا کے مسائل سے ہے، کیونکہ اس میں پرانے زیور کو نئے زیور کے بدلے کسی مدت کے لیے مؤخر کیا جا رہا ہے۔ اس پر تفصیلی شرعی حکم درج ذیل ہے:

مسئلے کی وضاحت:

پرانے سونے کے زیور کو نئے زیور کے بدلے میں دینا اور اس پر ایک سال کی مدت مقرر کرنا، اگرچہ بظاہر ایک معاملہ تجارت معلوم ہوتا ہے، لیکن شریعت کی رو سے اس میں درج ذیل قباحتیں ہیں:

۱- ربا الفضل:

یہ معاملہ سونے کے بدلے سونا دینے کا ہے، اور شریعت میں نقد ہی نقد اور

برابر برابر ہونا ضروری ہے، کیونکہ سونا ربوی اموال میں شامل ہے۔ سونے کے بدلے سونے کو مؤخر کرنا ربا النسیئہ کہلاتا ہے، جو قطعی طور پر ناجائز ہے۔

۲- بیع سلف کی شرائط:

بیع سلف میں رقم یا چیز کو نقد دینا ضروری ہے، جبکہ آپ کی صورت میں خریدار نے صرف پرانا سونا دیا، اور اس کے بدلے نیا سونا ایک سال کے بعد وصول کرے گا۔ ایسی بیع شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ غرر اور جہالت پر مشتمل ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں سے دلائل:

۱- ہدایہ:

قال فی الہدایۃ:

"والذهب بالذهب مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد، فإذا كان فيه فضل أو نساء كان الربا، وكذلك الفضة بالفضة" (ہدایہ، کتاب البیوع، باب الربا، جلد 3، صفحہ 48، مطبع: دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: "سونے کو سونے کے بدلے دینے میں لازم ہے کہ برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہو، اگر اس میں زیادتی یا تاخیر ہو تو یہ ربا ہوگا، اور یہی حکم چاندی کا ہے"۔

۲- درمختار:

قال فی الدر المختار:

"ومن شرط بيع الربويات أن يكون يدا بيد، فإن كان نساء كان

حراما" (الدرالمختار، کتاب البیوع، باب الربا، جلد 5، صفحہ 160، مطبع: دارالفکر)

ترجمہ: "ربوی اشیاء کی خرید وفروخت میں شرط ہے کہ ہاتھوں ہاتھ ہو، اگر تاخیر ہوتو یہ حرام ہے"۔

۳-فتح القدیر:

قال فی فتح القدیر:

"**إذا كانت المعاوضة بين الربويات متفاضلا أو نساء فلا يجوز بالإجماع**" (فتح القدیر، کتاب البیوع، باب الربا، جلد 7، صفحہ 36، مطبع: داراحیاءالتراث العربی)

ترجمہ: "اگر ربوی اشیاء میں کسی بھی قسم کی زیادتی یا تاخیر ہوتو یہ اجماعاً ناجائز ہے"۔

۴-البحر الرائق:

قال فی البحر الرائق:

"**ولا يجوز تأخير أحد البدلين الربويين لما في ذلك من شبهة الربا**" (البحر الرائق، کتاب البیوع، باب الربا، جلد 6، صفحہ 101، مطبع: دارالکتب العلمیہ)

ترجمہ: ربوی اموال میں سے کسی ایک کے بدلے کو مؤخر کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں ربا کی شبہہ پائی جاتی ہے"۔

۵-بدائع الصنائع:

قال فی بدائع الصنائع:

"**فإن كان فيه فضل أو نساء لم يجز، لأن الفضل يوجب الربا،**

والنساء یوجب الجهالة فی العوضین" (بدائع الصنائع، کتاب البیوع، باب الربا، جلد 4، صفحہ 123، مطبع: دارالکتب العلمیہ)

ترجمہ: ''اگر اس میں زیادتی یا تاخیر ہو تو جائز نہیں، کیونکہ زیادتی ربا کو واجب کرتی ہے اور تاخیر معاوضہ میں جہالت پیدا کرتی ہے''۔

حکم شرعی:

یہ معاملہ ربا النسیئہ کی وجہ سے قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔ شریعت میں سونے کے بدلے سونا دینے کی صورت میں نقد اور برابر برابر ہونا ضروری ہے، تاخیر یا اضافہ دونوں ممنوع ہیں۔

سونے کا سونے سے تبادلہ کی ایک شکل اور اس کا حکم

سوال: (6)

اگر خریدار ۱۸ کیریٹ سونے کا زیور دے کر ۲۲ کیریٹ سونے کا زیور لینا چاہتا ہو تو پھر تاجر یہ عمل کرتا ہے کہ خریدار کے ۱۸ کیریٹ سونے میں ۷۵ فیصد جو خالص سونے کی مقدار ہے، اس کی موجودہ (پرانا سونا حوالے کرنے کے دن کی) قیمت نکالتا ہے پھر اتنی قیمت میں ۲۲ کیریٹ کا سونا کتنے تولے آتا ہے؟ اس کا حساب کرتا ہے، پھر اسی دن تولے اور وزن میں اس کو خریدار کے لئے طے کر دیتا ہے؛ البتہ ایک سال مکمل ہونے کے بعد وہ زیور اس کے حوالے کرتا ہے۔ اس صورت میں

ظاہر ہے خریدار کو ۱۸ ر کیریٹ کے پانچ تولے کے بدلے میں ۲۲ کیریٹ کے مکمل پانچ تولے نہیں ملتے ؛ بلکہ چار تولے سے کچھ کم ملتے ہیں ؛ البتہ اسے یہ فائدہ ہو جاتا ہے کہ پرانے سونے کے مقابلے میں نیا معیاری سونا مل جاتا ہے اور سونا دار کو یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ پرانا سونا لے کر اپنے کاروبار میں مشغول کر کے نفع کماتا ہے تو کیا اس طرح معاملہ کرنا شرعا جائز ہوگا ؟ اس کی فقہی تطبیق کیا ہوگی ؟ ایک سال بعد وصول کرنے کے معاہدے کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنا شرعا جائز ہوگا ؟

جواب:(6)

سونے اور چاندی کی خرید وفروخت میں شرعی اصول یہ ہے کہ یہ اجناس ربوی اشیاء میں شامل ہیں، جن کی خرید وفروخت میں اگر ہم جنس کے ساتھ ہم جنس کا تبادلہ ہو تو اس میں مساوات اور یداً بید (نقدلین دین) شرط ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مذکورہ معاملہ کئی شرعی مسائل پیدا کرتا ہے، جنہیں تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

۱-سونے کا تبادلہ:

فقہ حنفی کے مطابق سونے کا سونے کے ساتھ تبادلہ برابر مقدار میں ہونا ضروری ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، مثلا بمثل، يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد" (صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الصرف)

ترجمہ: ''سونا سونے کے بدلے، اور چاندی چاندی کے بدلے برابر برابر اور نقد ہو۔ اور اگر مختلف اصناف ہوں تو جیسے چاہو بیچ سکتے ہو بشرطیکہ نقد ہو''۔

اس حدیث کی روشنی میں 18 کیریٹ اور 22 کیریٹ سونا بھی ''ہم جنس'' کے زمرے میں آتا ہے، اور اس کا تبادلہ برابر وزن میں اور نقد ہونا شرط ہے۔ معاملہ ایسا نہ ہو تو ربا الفضل اور ربا النسیئہ دونوں کا احتمال ہے، جو حرام ہے۔

۲- ادھار کی شرط:

ایک سال بعد زیور کی حوالگی کی شرط واضح طور پر ربا النسیئہ میں داخل ہے، کیونکہ فقہ کے اصول کے مطابق ربوی اشیاء میں نقد (ہاتھوں ہاتھ) تبادلہ ضروری ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''والصرف يشترط فيه شرطان: التقابض قبل التفرق، والمساواة في القدر إذا كان الجنس متحدا'' (بدائع الصنائع، کتاب الصرف، دار الکتب العلمیۃ، جلد 5، صفحہ 217)

ترجمہ: ''بیع صرف (سونے چاندی کے تبادلے) میں دو شرطیں ہیں: (۱) مجلس کے اندر قبضہ مکمل ہونا، اور (۲) اگر جنس ایک ہو تو مقدار میں برابری''۔

لہٰذا، ایک سال بعد سونا دینا شریعت کے خلاف ہوگا، کیونکہ اس میں قبضہ مؤخر ہو رہا ہے۔

۳- خالص سونے کی مقدار اور کمی بیشی:

18 کیریٹ سونا 75 فیصد خالص ہوتا ہے، جبکہ 22 کیریٹ زیادہ خالص ہے۔ اس فرق کی بنیاد پر 18 کیریٹ کو 22 کیریٹ میں تبدیل کرنے کے عمل میں وزن کی کمی آتی ہے۔ یہ مساوات کی شرط کے خلاف ہے، جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے:

''فإنه إذا كان الجنس متحدا، شرط فيه التماثل حقيقة أو حكما''

(فتح القدیر، کتاب البیوع، مکتبہ رشیدیہ، جلد 6، صفحہ 493)

ترجمہ: ''اگر جنس ایک ہو، تو اس میں حقیقی یا حکمی برابری شرط ہے''۔

۴- فقہی تطبیق:

مذکورہ معاملہ فقہی اعتبار سے بیع صرف کے اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ:

۱- وزن میں برابری نہیں۔

۲- قبضہ مجلس میں مکمل نہیں ہو رہا۔

۳- خریدار کو مکمل اختیار نہیں دیا جا رہا، بلکہ ایک سال کا انتظار لازم کیا جا رہا ہے۔

یہ تمام امور ربا کے زمرے میں آتے ہیں، اور ربا کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے:

''وأحل الله البيع وحرّم الربا'' (البقرۃ:275)

ترجمہ: ''اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا''۔

فقہی کتابوں کے حوالے:

۱-المبسوط للسرخسی:

"ولا یجوز فی الصرف دین بدین لأنه مال یتعجل فیه البدلین فاشتراط أحد البدلین فیه کاشتراط البدلین" (المبسوط، کتاب الصرف، دار المعرفۃ، جلد 14، صفحہ 25)

ترجمہ: "بیع صرف میں دین بدین (ادھار کا معاملہ) جائز نہیں، کیونکہ اس میں دونوں عوض فوری لازم ہیں، اور ایک عوض کو مؤخر کرنا ایسا ہے جیسے دونوں کو مؤخر کرنا"۔

۲-ہدایہ:

"إذا کانا جنسًا واحدًا لا یجوز إلا متماثلین سواء بسواء یدًا بیدٍ"

(الہدایہ، کتاب البیوع، دار الفکر، جلد 3، صفحہ 128)

ترجمہ: "اگر جنس ایک ہو تو صرف برابر مقدار میں اور ہاتھوں ہاتھ تبادلہ جائز ہے"۔

۳-بدائع الصنائع:

(عبارت پہلے ذکر کی جا چکی ہے)

۴-رد المحتار:

"ویشترط التقابض فی المجلس فی البیع بینهما" (رد المحتار، کتاب البیوع، دار الفکر، جلد 5، صفحہ 206)

ترجمہ: ''ان دونوں (سونے اور چاندی) کی بیع میں مجلس کے اندر قبضہ شرط ہے''۔

۵-مجمع الأنہر:

''شرط التقابض قبل التفرق فی بیع النقد بالنقد'' (مجمع الأنہر، باب الربا، دارالکتب العلمیۃ، جلد 2، صفحہ 456)

ترجمہ: نقد کے بدلے نقد کی بیع میں مجلس کے اندر قبضہ شرط ہے''۔

حکمِ شرعی:

مذکورہ صورت میں یہ معاملہ شرعی طور پر ناجائز ہے، کیونکہ:

۱-سونے کے تبادلے میں برابری کی شرط نہیں پائی جارہی۔

۲-نقدلین دین کی شرط پوری نہیں ہورہی، بلکہ ایک سال کی تاخیر ہے۔

۳-یہ معاملہ ربا الفضل اور ربا النسیئہ کے زمرے میں آتا ہے، جو قرآن وسنت سے حرام ہیں۔

اگر نئے اور پرانے سونے کی قیمت الگ الگ لگا کر تبادلہ کیا جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: (7)

بعض مرتبہ نیا زیور خریدنے کے لئے گاہک اپنا پرانا زیور دوکان دار کے

پاس لاتا ہے، اس زیور کی روپیوں میں قیمت علیحدہ سے کی جاتی ہے اور نیا زیور جو گاہک لینا چاہتا ہے، اُس کی قیمت علیحدہ مقرر کی جاتی ہے، ان دو قیمتوں میں جو فرق ہو، صرف اس کا لین دین کرلیا جاتا ہے، تبادلہ میں بسا اوقات ایسی صورت بھی پیش آتی ہے کہ مثلا پرانے سادہ غیر جڑاؤ زیور کا کل وزن چھ تولہ ہے اور قیمت تین لاکھ روپے مقرر ہوئی اور نئے سادہ غیر جڑاؤ زیور کا وزن پانچ تولہ ہے اور قیمت تین لاکھ روپے طے ہوئی، کیوں کہ نئے زیور میں مزدوری اور ویسٹیج بھی شامل کی جاتی ہے، اس صورت میں صرف دونوں زیوروں کا تبادلہ ہوا، نقد روپیوں کا کوئی دخل نہیں ہوا۔ تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟ اور یہاں درمیان میں بعینہ نقد رقم کے لین دین یا اس کا ذکر آنے کی وجہ سے کیا حکم پر کوئی اثر پڑے گا؟ اگر یہ صورت ناجائز ہو تو جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

جواب:(7)

آپ کے سوال کا تعلق زیورات کی خرید وفروخت کے دوران پرانے اور نئے زیورات کے تبادلے سے ہے۔ اس صورت حال میں اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل اصولی مسائل کا جائزہ لینا ضروری ہے:

1-سونے کے بدلے سونا دینا:

سونے کے بدلے سونے کا تبادلہ شریعت میں ''ربوی معاملہ'' کہلاتا ہے، اور اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

وزن برابر ہونا ضروری ہے۔

معاملہ مجلس میں نقداً ہو (یعنی کوئی اُدھار نہ ہو)۔

اگر ان میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی ہو تو یہ معاملہ سود میں داخل ہوگا جو شرعاً ناجائز ہے۔

۲-مزدوری یا ویسٹیج شامل کرنا:

اگر نئے زیور میں مزدوری یا "ویسٹیج" کی قیمت شامل کی جاتی ہے، تو اس اضافی قیمت کے سبب یہ معاملہ "سونے کے بدلے سونے" کے بجائے "سونے کے بدلے سونا بمع قیمت" میں تبدیل ہو جائے گا، جو فقہ حنفی کی رو سے ناجائز ہے، کیونکہ اس میں عدم مساوات اور سود کا شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالے:

۱-ہدایہ:

"وإذا بيع الذهب بالذهب، أو الفضة بالفضة، يشترط أن يكونا مثلاً بمثل يداً بيد، فإذا زاد أحدهما على الآخر، أو كان نسيئة، لم يجز" (فتح القدير، كتاب البيوع، باب الصرف، ج6، ص218، مطبع: دار الكتب العلمية، بيروت)

ترجمہ: "جب سونا سونے کے عوض بیچا جائے یا چاندی چاندی کے عوض، تو برابری اور نقد ہونے کی شرط ہے۔ اگر کسی ایک طرف زیادتی ہو یا معاملہ اُدھار ہو تو یہ

ناجائز ہے''۔

۲-الدرالمختار:

''لو باع الذهب بالذهب يشترط التساوی يداً بيد، ولا يجوز بيع الشیء بجنسه مع زيادته'' (ردالمحتار، ج4،ص181، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: جب سونے کا تبادلہ سونے سے کیا جائے تو برابری اور نقد ہونے کی شرط ہے، اور اپنی جنس میں کسی زیادتی کے ساتھ بیچنا ناجائز ہے''۔

۳-البحرالرائق:

''وَفِیْ بَيْعِ الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ يَشْتَرِطُ التَّمَاثُلُ وَالتَّقَابُضُ'' (البحرالرائق، ج6،ص293، مطبع: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ:''سونے کے بدلے سونے کی بیع میں مساوات اور قبضہ شرط ہے''۔

۴-مجمع الأنہر:

''ولا يجوز بيع ذهب قديم بجديد مع اختلاف الوزن وإن كان بسبب المصنوعية'' (مجمع الأنہر، ج2،ص445، مطبع: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ:''پرانے سونے کا نئے سونے سے تبادلہ وزن کے فرق کے ساتھ جائز نہیں، چاہے وہ فرق زیورسازی کی وجہ سے ہو''۔

۵-بدائع الصنائع:

''ولا يجوز بيع الذهب بالذهب، والفضة بالفضة إلا متساويين مع

القبض فی المجلس" (بدائع الصنائع، ج5،ص199،مطبع: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: ''سونے کا سونے کے ساتھ یا چاندی کا چاندی کے ساتھ تبادلہ صرف برابر ہونے اور مجلس میں قبضہ کے ساتھ جائز ہے''۔

آپ کے سوال کا جواب:

ا- بیع کا موجودہ طریقہ کار:

اگر پرانا زیور نئے زیور کے ساتھ وزن اور قیمت میں مختلف ہو، اور اس میں صرف اضافی رقم ادا کی جائے یا صرف زیورات کا تبادلہ ہو تو یہ صورت فقہ حنفی کے اصول کے مطابق ناجائز ہے، کیونکہ سونے کا سونے کے ساتھ وزن میں فرق کے ساتھ تبادلہ سود کے دائرے میں آتا ہے۔

۲- جواز کی صورت:

یہ معاملہ جائز کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے:

پرانے زیور کو پہلے الگ سے بیچ دیا جائے اور اس کی مکمل قیمت نقد وصول کر لی جائے۔

نئے زیور کو اس کے علیحدہ وزن اور قیمت کے ساتھ خرید لیا جائے۔

اس طرح دونوں معاملات الگ ہوں گے اور سود کا شبہ ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ:

موجودہ طریقہ کارنا جائز ہے، کیونکہ یہ ''ربا'' کے زمرے میں آتا ہے۔ جواز کی صورت یہ ہے کہ پرانے زیور کو الگ سے فروخت کیا جائے اور نئے زیور کو الگ سے خریدلیا جائے۔

سوناخرید کر دوسرے تاجر کوفروخت کرنااور قیمت بعد میں لینے کا حکم

سوال:(8)

سونے کی خرید وفروخت کا ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ خریدار زیورات اُدھار خرید کرانہیں دوسرے تاجروں (جن کے پاس زیورات کی دوکانیں ہوتی ہیں) کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، لیکن وہ قیمت فوراادانہیں کرتے ، بلکہ کئی دن کی تاخیر سے خالص سونے (بسکٹ وغیرہ) کی شکل میں قیمت ادا کرتے ہیں، نقدروپیہ کی شکل میں ادانہیں کرتے ہیں، پھر یہ شخص اپنے بائع (جس سے زیورات اُدھار خریدا تھا) کوبشکل بسکٹ ہی قیمت ادا کرتا ہے؛ اس لئے کہ اس کے پاس نقدادائیگی کے لئے رقم ہوتی ہی نہیں یا پھر بہت کم ہوتی ہے تو مذکورہ بالاصورت کے بارے میں یہ واضح کریں کہ کیا اس طرح زیورات کا تبادلہ شرعاً جائز ہے؟ اگر قیمت نقد کی شکل میں طے ہوا، البتہ ادائیگی بشکل زیور ہو یا قیمت ہی بشکل زیور طے ہو البتہ ادائیگی بعد میں ہو تو کیا ان دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہوگا؟ یا دونوں میں فرق ہوگا؟ اگر اس صورت میں کچھ

فساد ہے تو وہ کیسے دور ہوگا؟ یعنی جواز کی کیا صورت بن سکتی ہے؟

جواب:(8)

سونے کی خرید وفروخت سے متعلق مذکورہ معاملے کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے یہ اصول ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ سونے اور چاندی کے تبادلے میں شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر دونوں اشیاء ہم جنس ہوں (یعنی دونوں سونا یا دونوں چاندی ہو)، تو نقداً اور برابر برابر تبادلہ ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ربا (سود) لازم آئے گا، جو کہ قطعی حرام ہے۔ اور اگر یہ ہم جنس نہ ہوں (مثلاً سونا اور روپیہ یا سونا اور چاندی کا تبادلہ ہو)، تو نقداً معاملہ کرنا ضروری ہوگا، اگر نقد نہ ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ''ربا النسیئہ'' میں داخل ہوگا۔

فقہ حنفی کے اصول کی روشنی میں مسئلہ کا تجزیہ:

آپ کے سوال کے مطابق، مذکورہ معاملے میں تین اہم صورتیں ہیں:

۱-زیورات کا اُدھار خریدار سے خالص سونے (بسکٹ) کی شکل میں بعد میں قیمت ادا کرنا۔

۲- قیمت نقد طے ہونے کے باوجود ادائیگی سونے کی شکل میں بعد میں کرنا۔

۳- قیمت ہی زیور کی شکل میں طے ہونا اور ادائیگی بعد میں ہونا۔

یہ تمام صورتیں فقہ کے اصولوں پر پرکھنے کے بعد درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

پہلی صورت: زیورات اُدھار خرید کر بعد میں خالص سونے (بسکٹ) کی شکل میں قیمت ادا کرنا۔

یہ صورت ناجائز ہے، کیونکہ یہاں اُدھار خرید وفروخت میں سونے کے بدلے سونے کی تاخیر ہورہی ہے، جو "ربا النسیئہ" ہےاور شرعاً حرام ہے۔

دلائل:

۱-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَ الْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ مِثْلًا بِمِثْلٍ يَدًا بِيَدٍ، فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبَى" (صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف)

ترجمہ: سونے کے بدلے سونا اور چاندی کے بدلے چاندی برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ (نقداً) ہو، جو زیادتی کرے یا زیادہ طلب کرے وہ سود میں پڑ گیا۔

۲-امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"وإذا كان في البدلين ربا النسيئة يبطل العقد في البدلين؛ لأنَّ ربا النسيئة لا يختص بقدرٍ دونَ قدرٍ" (المبسوط، المکتبۃ العلمیۃ، جلد 13، صفحہ 7، کتاب البیوع)

ترجمہ: جب بدلے میں ربا النسیئہ ہوتو پورا عقد باطل ہوگا، کیونکہ ربا النسیئہ مقدار کے فرق کے بغیر مطلقاً ممنوع ہے۔

دوسری صورت: قیمت نقد طے ہولیکن ادائیگی خالص سونے (بسکٹ) کی شکل میں بعد میں ہو۔

یہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ قیمت نقد طے ہونے کے باوجود ادائیگی تاخیر سے کرنا ربا النسیئہ میں شامل ہوگا، جب کہ شریعت نے سونے کی خرید وفروخت میں نقد ہونے کو لازم قرار دیا ہے۔

دلائل:

ا-امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"وَإِذَا كَانَ التِّبْرُ بِالتِّبْرِ، وَالحُلِيُّ بِالتِّبْرِ يَجِبُ التَّقَابُضُ قَبْلَ التَّفَارُقِ، وَإِنْ كَانَ أَحَدُهُمَا ذَهَبًا وَالْآخَرُ فِضَّةً" (بدائع الصنائع، دارالکتب العلمیۃ، جلد 5، صفحہ 181)

ترجمہ: جب دونوں جانب تبر (سونا) ہو یا ایک جانب زیور اور دوسری جانب تبر، تو تقابض (ہاتھوں ہاتھ لین دین) قبل از تفریق لازم ہے، خواہ ایک طرف سونا ہو اور دوسری طرف چاندی۔

تیسری صورت: قیمت زیور کی شکل میں طے ہونا اور ادائیگی بعد میں ہونا

یہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی سونے کے بدلے سونے کا اُدھار لینا شامل ہے، جو ربا النسیئہ کے تحت آتا ہے۔

دلائل:

ا-امام مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

"وإذا كان أحد البدلين من الأموال الربوية يُشترط فيها التقابض، ولو تأخر يبطل العقد" (الہدایۃ، داراحیاء التراث العربی، جلد 3، صفحہ 71)

ترجمہ: جب بدلے میں سے ایک جانب ربوٰی مال ہو، تو تقابض (نقد لین دین) شرط ہے، ورنہ عقد باطل ہوگا۔

جواز کی صورت:

اس معاملے میں شرعی جواز پیدا کرنے کے لیے درج ذیل امور کا لحاظ کیا جائے:

۱-اگر زیورات اُدھار خریدے جائیں تو ان کی قیمت نقد یا چیک کی شکل میں فوری ادا کی جائے، نہ کہ خالص سونے یا بسکٹ کی شکل میں۔

۲-اگر خالص سونے یا بسکٹ کے بدلے زیورات خریدے جا رہے ہیں تو یہ لین دین نقداً ہو، اُدھار نہ ہو۔

۳-اگر ادائیگی مؤخر کرنی ضروری ہو تو قیمت نقد طے کر کے فوری طور پر ایک دوسرے کے حوالے کر دی جائے، تاکہ ربا النسیئہ کا ارتکاب نہ ہو۔

MAKTABA HABIBUL UMMAT

JAMIA ISLAMIA DARUL ULOOM

MUHAZZABPUR P.O.SANJARPUR DISTT. AZAMGARH U.P. INDIA

Mobile: 09450546400